غالب شناسی

انتخاب

اردو و فارسی

معہ دیباچہ

ظ انصاری

کچھ اِس انتخاب کے بارے میں

نیا جاندار شعر وہ ہے جو ذرا دیر تک نیا رہے۔ غالب کے ہاں نیا پرانا ہر طرح کا شعر ملتا ہے مگر وہ جو اپنے جنم دن سے سوا ڈیڑھ سو سال بعد آج تک تازہ دم معلوم ہوتا ہے اور خود ہماری زندگی کی پیچدار، ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی، دُور دراز تک پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں پر ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے، وہ اِس انتخاب کی نظر سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔

۳۵۰ صفحات کے اس 'انتخابِ غالب' کو چھاننے پھٹکنے میں کم و بیش تین سو طویل شامیں تو ضرور کھپی ہیں۔ اور اس مدت میں اُردو اور فارسی کلام کے وہ سارے انتخاب نظر کے سامنے رہے جو پچھلے سو برسوں میں مختلف اہلِ ذوق نے کیے اور چھاپے ہیں۔ خود غالب نے نواب رامپور کی خاطر جو انتخاب (۱۸۶۱ء میں) کیا تھا اور جسے مولانا عرشی نے بڑی نفاست سے ہاتھ میں (۱۹۴۲ء) کرنل بشیر حسین زیدی کی خاص توجہ کے ساتھ شائع کرایا، وہ اس انتخاب کی بنیاد بن سکتا تھا، لیکن اس میں بھی بعض نئے اور جاندار شعروں کی غیر حاضری سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غالباً شاعر کو اپنے ممدوح یا مخاطب کے مزاج کا زیادہ لحاظ رہتا ہوگا، اپنے بعد والوں کا نہیں، ورنہ اُن کے تخلیقی عمل میں تو تنقیدی عمل بھی ساتھ چلتا رہا ہے۔

اوّل اوّل یہ کام بھی فرمائشی تھا، دو ہزار اشعار میں کلامِ غالب کا ایک انتخاب روسی زبان میں شائع ہونا تھا۔ ایک ایک مصرعہ اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا اور ۱۹۶۸ء کے ستمبر تک روسی زبان کے اہلِ علم اور اہلِ اَدب کی خاطر یہ کام مکمل ہو چکا تب مجھے تشنگی کا احساس ہوا۔ پھر سے سارے انتخابوں اور کلیات پر نظر ڈالی، تو دیکھا کہ بہت کچھ بچ رہا ہے جس کا لطف اہلِ زبان ہی لے سکتے ہیں۔ یوں موٹی چھلنی سے چھن کر کوئی ایک ہزار شعر اور نکلے، اور پھر تیسری چوتھی بار ایک ہزار کے قریب ملے۔ کمیاب اور نو دریافت نسخوں سے بھی چند شعر ایسے ہاتھ آئے جو ابھی عام نہیں ہوتے ہیں۔ بعض ایسے خیال جو اُوپر سے چلے آ رہے تھے، اور اسی لئے زبانوں پر چڑھے، دلوں میں اُترتے ہوئے تھے، مگر غالب نے اپنے برش سے کوئی رنگ ہلکا یا گہرا کر دیا ہے، لائن سیدھی یا ترچھی کر دی ہے، وہ بھی جگہ پا گئے، مگر وہ جن میں لفظ کی آوازوں کا، بندش کا، یا محض شہرتِ عام کا مزا تھا، وہ یہاں نہیں سماتے۔ وہ بھی شریک ہوتے تو ضخامت اَب سے دوگنی ہو جاتی   مفصّل دیباچے کو ٹیکسٹ بک کا رنگ دیا گیا تاکہ غیر مُلکی پڑھنے والوں کو اُس تمام ذخیرے کا ہلکا سا اندازہ ہو جائے جو غالب شناسی کے سلسلے میں قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے۔

اِس انتخاب کو اپنے مکمل اور جامع و مانع ہونے کا دعوا تو نہیں، تاہم شاعر کے اُردو اور فارسی کُلّیات سے (جن میں اب چودہ ہزار سے زیادہ اشعار ملتے ہیں) یہ بڑی حد تک بے نیاز ضرور کر دیتا ہے اور فارسی اشعار پر ایک گہری نظر ڈالنے سے غالب کا وہ دعوا بھی ثابت ہوتا ہے جو وہ اپنے فارسی کلام کی برتری کے متعلق کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں فارسی جیسی پھیلی ہوئی، نفیس و شیریں زبان نے غالب دہلوی سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔

نیّت یہ تھی کہ فروری ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کے موقع پر یہ انتخاب شائع ہو جائے۔ کتابت کی کمزوریوں اور بیچ سفر میں راہوار بدلنے کی مجبوریوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ بہر حال خوشنویس نورالدین آزاد کی ہُنرمندی اور لیڈرز پریس کی فیاضی سے اب کہیں تین برس بعد سوکھے دھانوں پانی پڑا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ چار خوشنویسوں (عبدالسلام، سلامت رضوی، شمس عظمٰی اور محمد قاسم) کے قلموں کے باوجود، کتابت کی غلطیاں باقی نہ رہیں۔

ترتیب کی کیفیت یہ ہے کہ ردیف کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اوّل چھپے ہوئے کُلّیات سے، اور پھر دوسرے مجموعوں سے خطوں سے (ان کی اشاعت کا زمانہ دیکھتے ہوئے) ردیف وار شعر چُن دیے گئے ہیں۔ اِملا میں بھی نئے اور پُرانے کا امتیاز مدِ نظر رہا ہے۔

میں اشاعت کی تیاریوں سے کوئی سات ہزار کلومیٹر دور بیٹھا ہوں۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں جو نئے مضامین غالب پر آئے ہوں گے، جو نئی تصانیف نکل رہی ہوں گی، جو نئے اشعار یا نکتے دریافت ہوئے ہوں گے، اگر وہ ہاتھ آتے تو اُن کا ذکر بھی دیباچے میں ہو جاتا۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ یہ دیباچہ (جو ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے) پچھلے سَو برس کی غالب شناسی کے اہم نکات کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے اور جو کچھ مجھے اپنی طرف سے کہنا یا جتانا تھا، وہ بھی مختصر لفظوں میں کہہ دیا ہے۔

اب غالب شناسی کے سلسلے کی تین کتابیں میری طرف بقایا ہیں، مونوگراف، مجموعہ مضامین، بعض اشعار کی وضاحت کے ساتھ مثنوی کے فن اور خود غالب کی مثنویوں پر ایک مجلّد۔ ان کی اشاعت کی باری بھی آئے گی۔ پہلے یہ دیکھ لیں کہ اس "انتخاب" سے کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا" یا وہ بھی نہیں نکلا۔

ظ انصاری
(انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز آرمیانسکی نمبر۲۔ ماسکو)
1970

ہدیۂ انتساب

○

امیر الجامعة السیفیة (سورت)

ڈاکٹر یوسف نجم الدّین صاحب

جن کی صحت و سلامتی
دنیا کے بہت سے علمی اور عملی کاموں کیلئے
صحت و سلامتی کی ایک خاموش ضمانت ہے

○

دگر ست آں کہ کند سیر چمن مثلِ نسیم
واں کہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر ست

ظ۔ انصاری

غالب شناسی کے زینے

مرزا غالب نے سوچا فارسی میں، لکھا بھی زیادہ تر فارسی ہی میں (اشعار کی تعداد گیارہ ہزار تین سو کچھ) زبانوں پر چڑھے اردو میں ـــــ (ان کے تقریباً دو سو اشعار خاص وعام کی روزمرہ گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔) لیکن ان کی قدر ہوئی انگریزی پڑھے لکھوں کی بدولت یا مغربی ادبیات کا ذوق رکھنے والوں کے دم سے۔

غالب اپنی زندگی میں بھی مقبول تھے، تاہم یہ مقبولیت ایک محدود حلقے تک رہی، خاص طور سے ان تعلیم یافتہ لوگوں تک جو فارسی ادبیات پر نظر رکھتے تھے۔ ان کا اردو دیوان بائیس برس میں پانچ بار چھپ چکا تھا۔ یہ حیثیت غالب کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ فارسی دیوان جو اردو سے تقریباً چھ گنا ہے، زندگی میں دو بار شائع ہوا، اور پچھلے سو سال میں صرف پانچ اشاعتوں تک پہنچا ہے جن میں تین اڈیشن پچھلے سال مختلف مقامات سے نکلے ہیں۔ اردو دیوان اور انتخابات کی سَو سے زیادہ اشاعتیں نکل چکی ہیں۔

کیا راز ہے کہ غالب کی قدر ان کے مرنے کے بعد زیادہ ہوئی؟

اسی سوال کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ غالب کی شاعری اور شخصیت کا وہ کون سا پہلو ہے جو عہدِ حاضر کے ذہن کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟

غالب پر قلم اٹھانے والے قابلِ ذکر اہلِ نظر نے اپنے اپنے طور پر اس سوال کے جواب دیے اور وہ جواب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، غالب کی تلاش میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

غالب کی ان دریافت شدہ خصوصیات کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نظر میں رکھنا چاہیے کہ کوئی فنکار جو اپنی

زندگی کے بعد بھی جیتا ہے، محض ایک انگی (One sided) صفات سے نہیں جیتا۔ گہرائی کے سوا حسن، اور حسن کے سوا کوئی نہ کوئی نیاپن بھی ضرور رہتا ہے اس کے پاس۔ یہ نیاپن ممکن ہے فنکار کے اپنے زمانے میں نمایاں رہا ہو، لیکن وہ زمانہ، ایک خاص تاریخی یا سماجی دَور گزر جانے کے ساتھ بے حیثیت ہو جائے پُرانے پن میں شمار ہونے لگے۔ اور ممکن ہے ایک خاص دَور کے اندر کچھ اہم نہ ہو، وہ دَور گزر جانے کے بعد اہم ہو جائے۔

غالؔب کے ہاں جن خصوصیات کی قدر بعد میں ہوئی اور جنھیں ہم اس کے پورے شاعرانہ وجود میں اُبھرا ہوا دیکھتے ہیں وہ پُرانے اور نئے پن کا امتزاج ہیں۔ پُرانے ذخیرے کی بہترین روایات سے غالؔب نے قطعی طور پر رشتہ نہیں توڑا بلکہ ان کا رس اپنے ہاں جذب کر کے، ان پر نئے ذہن، فکر اور فن کے لب و لہجہ کا اضافہ کیا۔ وہ دونوں لحاظ سے اہم ہیں؛ ان کی فکر میں فارسی اور اُردو، ادبیات کی بہترین لفظی اور معنوی روایات کے عناصر چھن کر صاف ہو کر اس طرح آئے ہیں کہ ان میں سوچ کا سامان بھی اتنا ہی ہے جتنا لفظوں اور آوازوں سے لطف اندوز ہونے کا امکان۔ یہ صفات الگ الگ شخصیتوں میں بکھری یا پھیلی ہوئی تھیں۔ غالؔب کے ہاں وہ یکجا ہو گئیں اور اس طرح وہ قدیم و جدید کا سنگم بن گئے۔ اسی میں ان کا کمال پوشیدہ ہے۔

غالؔب کے معاصرین میں، جو ان سے قریب رہے اور جن کی رائے کو ہم عصر تنقید میں جگہ دی جا سکتی ہے، تین نام اہم ہیں: حالؔی، شیفتؔہ، اور میر مہدی مجرؔوح۔

حالؔی نے غالؔب کے کمال کا راز ان صفات میں پایا ہے: تازگیِ بیان، جدتِ ادا، شگفتگی اور معنوی تہہ داری یہ بات کہ مرزا نے اپنے بیان کو اوروں سے الگ کیا، معمولی سے خیال کو اچھوتے انداز سے بیان کیا، ان کے ہاں طنزیہ مسکراہٹ اور چھیڑ خانی پائی جاتی ہے اور ایک شعر پہلو بدل بدل کر مختلف معانی رکھتا ہے، حالؔی نے ہم کو بتائی —

(یادگارِ غالب ص ۱۳۰ - ۱۰۵)۔

شیفتہ کی ادبی کسوٹی پر غالب کا رنگ بہت کھرا ہے، وہ معانی کی نزاکت اور بیان کی متانت کو میزان بناتے ہیں اور میر کے بعد مومن اور غالب کو سب سے زیادہ وزنی قرار دیتے ہیں۔

مجروح نے نیاز مندانہ تقریظ میں (جو فارسی دیوان اشاعت اوّل کے آخر میں شائع ہوئی) غالب کی اس خصوصیت کو ابھارا ہے کہ ؎

براوجِ خرد ماہِ نو تافتہ

ریاضِ سخن سَردِ نو یافتہ

(عقل کی بلندی پر نیا چاند چمکا ہے، اور شاعری کے باغ میں نیا سَرو اُگ آیا ہے۔)

سر سید احمد نے بھی غالب کے کلام کی خوب تعریف کی ہے (آثار الصنادید، باب چہارم)، لیکن اس بیان سے کسی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا، اس لیے ہم ان کی رائے کو ادبی تنقید میں شمار نہیں کریں گے۔

غالب کو عظیم شاعر کی حیثیت سے حالی نے روشناس کیا، لیکن اس کے کمال کی نشاندہی اقبال نے کی تھی جو خود، کئی وجہوں سے غالب کے وارث سمجھے جاتے ہیں۔ اقبال نے غالب کے "لطفِ گویائی" میں تخیّل رسا اور "فکرِ کامل" کی ہم نشینی دریافت کی ہے اور یقیناً غالب شناسی میں یہ ایک اہم نکتہ بلکہ اضافہ ہے:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا

ہے پَرِ مُرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں

ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی زمانے میں غالب کو اپنے بہترین نقیب میسّر آئے۔ یہی زمانہ متحدہ

ہندستان میں قومی آزادی کی تحریک کا عنفوانِ شباب سمجھنا چاہیے۔ عبدالرحمان بجنوری نے غالؔب کو فکر و فن کا ایسا بے مثل ہیرو بنا کر پیش کیا جسے پندرہ مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد اس کی "تشکیل کامل" پر تان توڑی اور بتایا کہ غالؔب کی شاعری میں خود فلسفیانہ دریافت اور تلاش کے علاوہ مصوّری اور موسیقی کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ (محاسن کلام غالؔب)

ڈاکٹر عبداللطیف نے جہاں غالؔب کے ذاتی کردار کے جھول نمایاں کیے اور اسے زر پرستی کا شکار بتایا، وہیں دیوان غالؔب کی تاریخی ترتیب کا آغاز کر کے یہ خصوصیت بھی ظاہر کی کہ لفظی صنعت گری میں غالؔب کا مقام دوسرے اردو شعرا سے بلند ہے اور اس کے تمام کلام میں گہری فکر کے عناصر بکھرے ہوئے ہیں۔ (Ghalib. Hyderabad 1924)

اسی زمانے میں غالؔب کے نظامی اڈیشن پر ڈاکٹر سید محمود کے دیباچے نے غالؔب کو ہندستان کی قومی آزادی کا فکری نقیب قرار دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بعض اطلاعات بڑھا کر اور ان پر تبصرہ کر کے، غالؔب کے اشعار سے جا بجا حوالے دے کر عملی طور سے یہ ثابت کیا کہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں میں بھی غالؔب کی شاعری کارآمد نکلتی ہے۔ غالب کو انھوں نے مزاجِ شاعری کے اعتبار سے عہد جدید (بیسویں صدی) کا شاعر ٹھہرایا۔ (ص ۳۲، غالب اور ابوالکلام۔ غالب اکاڈمی)

حسرؔت موہانی اور نیاؔز فتح پوری بھی مولانا آزاد کی سی نگاہ اور آزادانہ فکری رجحان کے بزرگ تھے۔ غالب کو نئی روشنی کی لہروں پر رواں کرنے اور جدید تعلیم یافتہ حلقے میں پھیلانے کا ادبی فرض انجام دیتے وقت ان دونوں اہلِ قلم نے اسے جدت، اختراع، آزادانہ فکر اور زندہ دلی کا شاعر قرار دیا۔ نیاؔز نے اس کے ہاں "تفاؤل و مسرت" کا فلسفہ دریافت کیا اور اسی ضمن میں یہ بھی بتایا: "... غالؔب کی شاعری دراصل معنی آفرینی اور ندرتِ تعبیر و خیال کی شاعری تھی، لیکن وہ زندہ ہے دراصل اپنی زبان کی شاعری سے ــــــ جس کی مثالیں اس کے اُردو کلام سے بکثرت نکل سکتی ہیں۔" ــــــ (غالؔب کا آہنگ: نیاز۔ لکھنؤ) اگر ڈاکٹر لطیف نے غالؔب کے خطوط اور اشعار سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کے ہاں دنیاوی آسائش، مرتبے اور عزت کی کمی کا رونا بہت ہے جس سے کردار کی کمزوری ٹپکتی ہے اور بڑی شاعری کی صلاحیت برباد ہوتی ہے۔ تو غلام رسول مہرؔ نے غالؔب کو ہر ایک عیب سے پاک کر کے ولی اللہ ثابت کر دیا۔ مہرؔ نے زیادہ تر

اسلامی مجاہدوں کے تذکرے لکھے ہیں۔ غالب کو بھی وہ خدارسیدہ بزرگ بنا کر پیش کرتے ہیں، تاہم شاعری سے قطع نظر غالب کی نثر، خاص کر خطوط کو وہ اہمیت دی جس کے بغیر شاعر کی عظمت ظاہر نہ ہوتی۔

غالب کی حیات کے علاوہ ان کے فکری رجحانات اور فنکارانہ نظریات کو سمجھنے میں مولوی مہیش پرشاد نے "خطوط" کی اہمیت دریافت کی اور برسوں اس پر کام بھی کیا، لیکن نواب امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" نے فنکار کے ذہن کا سراغ لگانے میں خطوط اور شاعری دونوں سے یکساں کام لیا، دوسروں پر راہ کھولی۔

افراط و تفریط سے ہٹ کر شخصیت کی دریافت کے جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر جس شخص نے غالب کی حیات اور شاعری کے رموز تلاش کیے وہ شیخ محمد اکرام ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے اور قیام کے بعد اس علاقے میں غالب پر مہر اور اکرام سے زیادہ کسی نے کام نہیں کیا۔ دونوں کا انداز نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اکرام نے غالب کی خصوصیات کا سُراغ لگانے میں یہ واضح کیا کہ شاعر نے کتاب فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ ذہن کو قدیم کی تقلید سے آزاد کرانے میں عقلیت پر زور دیتا ہے اور "غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت کے باعث نہیں بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔۔۔ یہ حزن و افسردگی اس آدمی کی ہے جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور جسے اس سے محروم رہنا ناگوار ہے۔" (غالب نامہ ص ۳۱۰) غالب کی عقلیت کو Rationalism سے تعبیر کرنے اور اس کی صحت اور برتری دکھانے میں اکرام نے صوفی شعراء خاص کر اقبال سے اختلاف کیا ہے اور غالب کی تائید کی ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام اور قاضی عبدالودود، غالبیات کے سلسلے میں ہندستان کے سب سے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے غالب سے متعلق واقعات کی تصدیق اور تفصیل پر کام کیا ہے، غالب کے فن و فکر کی تلاش پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ مولانا عرشی اور مالک رام، دونوں کے نزدیک غالب کی دین اس کی نظم و نثر میں یکساں ہے اور دونوں میں ندرت خیال، معنی آفرینی اور جدت ادا سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ قاضی ودود اسے اُردو شعراء میں باکمال علمی اعتبار سے ناقص اچھا نثر نگار اور شگفتہ مزاج آدمی شمار کرتے ہیں۔ ("علم و فن" ڈائجسٹ۔ دہلی)

دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے فوراً بعد غالب کی مقبولیت اور بڑھی یورپی ادبیات اور ذہنی تحریکوں سے باخبر اہل قلم اس طرف متوجہ ہوئے۔

نواب اثر لکھنوی نے "مطالعۂ غالب" میں یہ ثابت کیا کہ غالب کے ہاں غزل کی روایت سے انحراف ہے، سوز و گداز کی کمی ہے، اردو کے دوسرے شعرا خصوصاً میر کے خیالات کو لہجہ بدل کر لکھتے ہیں اور ان کے فلسفیانہ بیانات میں تضاد ہے، عشق میں بھی اپنی جان اور اپنی آبرو ان کو عزیز ہے۔ پروفیسر شوکت سبزواری نے غالب کے فلسفۂ حیات موت، غم و نشاط، عشق و عقل پر قرآن و گیتا کے علاوہ مغربی فلسفے سے بھی روشنی ڈالی۔ (فلسفۂ غالب) اور نتیجہ نکالا:

"... ان کی شخصیت کی عظمت کا راز... غیر معمولی فکری صلاحیتیں ہیں۔ ان کی شخصیت فعلی ہے۔ انفعال غالب کے نزدیک "ہنگامۂ زبونیٔ ہمت" ہے... غالب خود بیں، خود پسند اور آزاد منش ہیں۔ خود بینی سے عزت نفس، خود پسندی سے غیرت اور آزاد منشی سے خودداری پیدا ہوتی ہے... غالب کے کلام میں یہ تمام جوہر ہیں۔" (ص ۲۵۳۔ غالب فکر و فن۔ کراچی)

احتشام حسین، آل احمد سرور، اور فیض احمد فیض نے ایک قیمتی مضمون کے ذریعے غالب کے فکر و فن کے نمایاں اوصاف معلوم کیے۔ پروفیسر احتشام نے غالب کی جدیدیت کا سماجی پس منظر تلاش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ دہلی سے کلکتے کا سفر، جدید ماحول اور ذہنی تحریکوں سے شاعر کی آگاہی اس کے خیالات تبدیل کرنے میں اہمیت رکھتی ہے۔ مستقبل کی جانب آنکھیں کھلی رکھنے اور قدیم کی فرسودگی سے اکتا جانے کی بدولت غالب کی شاعری اور نثر میں نئے عہد کا مزاج پیدا ہوا ہے۔ آل احمد سرور نے ایک عالمانہ اور شگفتہ تجزیے کے ذریعے بتایا کہ غالب اپنے سے پہلے کے اور موجود مسلمات اور نظریوں کو، جوں کا توں، قبول نہیں کرتا بلکہ ہر ایک ضابطے اور عقیدے پر سوالیہ علامت لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک "صحت مند تشکیک" ہے۔ وہ خوشی اور غم دونوں میں کھو نہیں جاتا بلکہ دونوں کی حقیقت پر ایک تیسرے آدمی کی طرح غور کرتا ہے اور یہی تشکیک اس کے کلام کو تازہ دم رکھتی ہے۔ فیض نے غالب کی پریشاں حالی کے پردے میں ایک اہم اور نمایاں وحدت "تلاش کی اداسی" ایک ایسی "اداسی" سے تعبیر کیا جو کسی فرد کے ذاتی غم کے بجائے ایک نسل یا دور کی اجتماعی ذہنی کیفیت ہے۔ اس میں ماضی کی یاد، حال کی بے کیفی اور مستقبل کی امید و ناامیدی کی کشمکش شامل ہے۔

مجنوں اور فراق گورکھپوری نے غالب کی امتیازی خصوصیت رمز وکنایہ، طنز، خودداری اور خود شناسی کو قرار دیا ہے۔ (نکاتِ مجنوں ۹۲۔ حاشیہ ۴۴، علم وفن ڈائجسٹ۔ انٹرویو) فراق نے ادب کے طالب علموں کو یہ جتا کر احسان کیا کہ غالب کے ہاں عشقیہ شاعری بہت کم ہے اور دنیا کی بڑی شاعری میں عشقیہ حصے کم ہی شامل ہیں۔ ان دونوں فاضل تنقید نگاروں کو اتفاق ہے کہ "غالب کے تغزل اور تصوف دونوں کو دل سے کہیں زیادہ دماغ سے تعلق ہے" (ص ۴۴، نکات) غالب کے عشق میں سپردگی نہیں، طنز کا لہجہ اور لیے دیے رہنے کی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے مختلف خطبوں میں غالب کی بعض خصوصیات پر زور دیا ہے، وہ "فکر کے عنصر، شخصیت کی انفرادیت" اور الفاظ کی خاص طرح کی بندش کو شاعر کا کمال قرار دیتے ہیں۔

"... جن اشعار میں فکر کا عنصر نہیں، وہاں بھی آہنگ اور لہجہ اور الفاظ کی بندش سے شعر پُرفن ہو گیا ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی شخصیت کی انفرادیت ان کے اسلوب کی ندرت بن گئی تھی۔" (افتتاحیہ خطبہ، غالب اکاڈمی دہلی)

قریب قریب آدھی صدی غالب کا سنجیدہ مطالعہ ہو چکنے کے بعد اردو ادب کے جانکاروں میں اب یہ بات بدیہی سمجھی جاتی ہے کہ غالب عہد حاضر کے مزاج کا شاعر ہے۔ اس کے ہاں گہرا تفکر رواں دواں ہے، اس کا لہجہ مردانہ ہے، وہ عشق کے معاملات میں بھی خودداری سکھاتا ہے۔ اس کے آہنگ پر فارسی کے کلاسیکی لب و لہجہ کا اثر ہے۔ وہ ذہنی فرسودگی سے نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بیان کی شوخی محض ظرافت نہیں بلکہ بامعنی اور گہرا طنز ہے ایک ایسے وجود کا، جو خود کسی اعتقاد یا نظریے کا پوری طرح پابند نہیں۔

پچھلے دس پندرہ برسوں میں غالب شناسی نے اس مقام سے آگے قدم اٹھایا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے فلسفے کے گہرے مطالعے اور فارسی ادبیات پر وسیع نظر رکھنے کے علاوہ، غالب کی حکمت اور شاعری کو اقبال کی ہم نشینی سے بھی حاصل کیا۔ انھوں نے رہنمائی کی کہ "برگزیدہ اشعار کی تعداد فارسی کے کلام میں بہ نسبت اردو مجموعہ اشعار کے کہیں زیادہ ہے ..

اس کا فارسی کلام فن کے لحاظ سے اردو کلام کی بہ نسبت بہت سُلجھا ہوا ہے" اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ "غالب نے فارسی شاعری
اردو کے بہت بعد شروع کی اور ایسے اساتذہ کے نمونے اپنے سامنے رکھے جن کے کلام میں سلاست اور لطافت تھی"۔ (افکارِ غالب
ص ۲۰۔ ۱۹) انھوں نے غالب کے فارسی کلام میں "برگزیدہ اشعار کی تشریح کی اور اس نکتے پر زور دیا کہ غالب کے
کلام میں لامتناہی کی تمنا کسی محدود شے سے مطمئن نہیں ہوتی اور اس طرح حرکت و حیات کا سبب بنتی ہے۔ غالب کے
اہم فارسی اشعار کی وضاحت اور تفسیر کر کے انھوں نے غالب کی مقبولیت کا ایک اور باب کھول دیا۔

میکش اکبرآبادی نے، کہ خود بھی خاندانِ صوفیا کے باقیات سے ہیں، غالب کو علم اور عقیدے کے اعتبار
سے صوفی قرار دینے کے بعد اپنے مختلف مضامین سے ثابت کیا کہ وجود و عدم اور حیات و موت کی حقیقت دریافت کرنے میں
شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریہ "الحق محسوس والخلق معقول" سے بھی ہٹ گئے اور شنکراچاریہ
کے ویدانت کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ تصوّف اور ویدانت کے اصول جہاں ہم زبان ہو جاتے ہیں، غالب وہاں ٹھہر کر آگے نکل
تو گئے لیکن محسوسات کے حُسن سے بے نیاز نہیں ہو سکے۔ یہی ان کی شاعری کا ایک دل کش پہلو ہے۔

ممتاز حسین نے مارکسی تعلیمات کی روشنی میں غالب کے 'میں' اور 'ہم' کی تشریح کی اور بتایا کہ غالب نے
غزل کی رمزی یا ایمائی زبان میں ذاتی تجربات کو عمومی شکل (Impersonal) دی ہے، ورطبری جذبات کی
ترجمانی کی ہے۔ وحدت الوجود کے نظریے کی مدد سے یہ سمجھا کہ "کائنات اپنی ذات (Essence) میں ایک ہے اور
اپنی صفات (Attributes) میں کثرت پذیر ہے۔ تمام عالم فطرت ایکائی ہے ور ترغیبات یا خواہشات زندگی
کا سرچشمہ ہیں، نہ ان سے بے پروائی یا تیاگ میں نجات ہے، نہ بے لگام چھوڑ دینے میں ـــــ ضرورت ہے ایسی لذت
پرستی کی جس میں انسان ہمدردی شامل ہو یعنی Humanized paganism غالب کی حس پسندی
میں سردار جعفری نے بھی اسی پہلو پر زور دیا ہے۔ (دیباچہ دیوانِ غالب) ممتاز حسین نے اپنی "تازہ تصنیف" غالب
کا فن "میں اسی تلاش کو دو آگے بڑھایا ہے اور زندگی کے خارجی واقعات کا عالمانہ تجزیہ کر کے ہمیں ان رشتوں کے
سمجھنے میں مدد دی ہے جو شاعر کے فکری و فنی محرکات میں پوشیدہ ہیں۔

خورشید الاسلام نے غالب کا مطالعہ ہندستان کے فارسی شعراء اور کلاسکی اُردو ادب کے پس منظر میں کیا اور ثبوت کے ساتھ دکھایا کہ غالب کے ہاں تصوف نمایاں ہے لیکن ساتھ ہی "مادیت یا حقیقت پسندی کا بھی ایک رجحان ملتا ہے جو تصوف کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے" (غالب۔ علی گڑھ ۱۹۶۰ء) نوجوانی میں ہی غالب کے ہاں ایک آفاقی انداز ہے۔ اور یہی انداز ہمارے دلوں کے دامن کھینچتا ہے۔ غالب کا تنگیِ کائنات کا شکوہ، دراصل اپنے حق کا مطالبہ ہے اور یہ حق اس کو پہنچتا ہے جس کے حوصلے قوی، آرزوئیں تازہ اور شوق بے پایاں ہوں، غالب کے شاعرانہ کمال کی دریافت میں شیخ اکرام کے پچیس سال بعد موسیٰ خاں کلیم دوسرے آدمی ہیں جنھوں نے نفسیات کی پوری مدد لی ہے۔ شخصیت کی تین سطحوں 'شعور، تحت الشعور اور لاشعور کو ایک رشتے میں پرو کر یہ جتایا کہ غالب کی اکثر غزلوں میں باطنی یا معنوی وحدت اور مضمون یا خیال کا ربط پایا جاتا ہے۔ (مقام غالب ص ۲۱۰۔ ۲۴۰) غالب کے وجدان میں دماغ شریک ہے، وہ شعوری فنکار ہے اور قلبی کیفیت کے بیان کرنے میں خردِ تخیلی (Imaginative reason) سے کام لیتا ہے۔ یہی صفت اسے فارسی اردو شعراء میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے خاص طور سے غالب کے آہنگ کو اپنا موضوع بنایا اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ غالب کو صرف اس عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے ــــــ ایک سے حالات کے دو شاعر دو الگ جذباتی دنیائیں رکھ سکتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ غالب کی "تخیلی فکر منطقی اور تخیلی فکر کے برخلاف ان کے وجدان سے سیراب ہوتی ہے ... ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ... اپنے تیکھے مردانہ پن کو موسیقی میں رچا دیا" ــــ (غالب اور آہنگ غالب۔ دسمبر ۱۹۶۹ء دلی)۔ انھوں نے اپنی تازہ ترین تصنیف میں انھیں خصوصیت کو بلا ترتیب جمع کر دیا ہے، جو آج تک لکھی جا چکی تھیں لیکن "تیکھے مردانہ پن کو موسیقی میں رچانے" کا دعوا یے دلیل جانے دیں۔ غالب کے آہنگ پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے البتہ روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے کہ خود صوتی آہنگ میں شاعر بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ بحروں اور الفاظ و علامات کے چناؤ میں غالب کو جذبے کی نوعیت تال میل مد نظر ہے۔

نیاز فتح پوری نے غالب کے ہاں اس نکتے پر زور دیا تھا کہ اپنی غزلوں میں، اگر غور سے دیکھا جائے تو

کوئی نہ کوئی ایک مصرعہ ضرور ایسا پایا جاتا ہے جو غالباً سب سے پہلے ذہن میں آیا اور اسی نے پوری غزل کی تحریک کی۔ اس مکمل مصرعے، محاورے یا لفظ و ترکیب میں خاص قسم کا آہنگ ہوتا ہے جو غالب کی نظر میں چڑھ جاتا ہے اور پھر اسی آہنگ کے سانچے میں غزل ڈھلتی ہے۔ (ماہنامہ نگار۔ جنوری ۱۹۶۹ء) مسعود حسین خاں نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ غالب اپنی غزل کے موڈ کے مطابق حروف اور آوازیں چنتے ہیں۔ مثلاً وہ غزل۔۔ "درد سے بھر نہ آئے کیوں۔۔۔کوئی ہمیں ستائے کیوں" نو شعر والی میں شاعر نے ۴۱ بار نون استعمال کیا ہے۔ (Nasalized vowels) کے ذریعے غنائیت اور غمگین موسیقی پیدا کی ہے۔۔۔" ستائے نہ بنے۔۔ بنائے نہ بنے" قافیہ ردیف کی غزل میں نون (ن) ۵۱ بار استعمال ہوا، اس میں نون غنہ بھی ہے اور نون منقوطہ بھی ـــــ جس کی تکرار سے خاص طرح کی آوازیں پیدا ہوئی ہیں اور پوری غزل میں درد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک نئی بات موصوف نے یہ بتائی کہ غالب کے منتخب دیوان میں جو دو درجن اعلا درجے کی غزلیں ہیں ان میں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ وغیرہ ثقیل آوازوں سے پرہیز کیا ہے تاکہ آہنگ میں سختی و کرختگی پیدا نہ ہونے پائے۔ "غالب کا صوتی آہنگ" مقالہ، سیمینار، دہلی۔ فروری ۱۹۶۹ء۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے لسانیات (Linguistics) کے اصولوں سے جانچ کر یہ دکھایا ہے کہ غالب نے اوزان کے آہنگ سے بڑا کام لیا ہے اور "اکثر صورتوں میں اپنے لہجے کو وزن کے مقررہ آہنگ پر حاوی کر دیا ہے"۔ (شاعر، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، بمبئی)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے انگریزی کی رومانوی اور جدید شاعری پر تنقید کی ادبیات کی نظر سے غالب کی خصوصیات کا پتہ لگایا اور توجہ دلائی کہ ولیم بلیک (William Blake) کی شاعری کی طرح "تخیل" کو یہاں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے ــ غالب اپنے نفسیاتی تجربوں، جذبوں اور تخیل [illegible] ورثہ ابھرتا ہے جن میں رنگ، حرکت، بجلی اور مقناطیسی صفت پائی جاتی ہے۔ [illegible] حدیں [illegible] مجسم وجود کا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جب ایک بے پردہ جسمانی تجربے کو [illegible] حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے، وہ تخیل کو بھڑکاتی ہے۔ غالب کے شاعرانہ کمال کا [illegible]

درکانوں کو بیک وقت متوجہ کرلیتا ہے۔ وہ ایسے رنگ چن دیتا ہے جو بے ارادہ ہماری نظر کھینچ لیتے ہیں اور پھر "آشتیِ چشم و گوش" سے دوشنع، ور بے قرار تصویریں منظر تصور پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ (مقالہ سیمینار دہلی۔ فروری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر محمد حسن نے مختلف موقعوں پر غالب کی شاعرانہ صفات کا جائزہ لیا ہے۔ تازہ ترین جستجو میں انھوں نے غالب کو "نئی داخلیت کی آواز" قرار دیا۔ کہا کہ اس کا "جذبہ روایتی کے بجائے انفرادی ہے۔۔۔ اس نے اردو شاعری کو صرف سوچنے کی قوت نہیں بخشی بلکہ شکستوں اور ناکامیوں سے بلند ہوکر زندگی گزرنے کا موقع دیا۔۔۔ ابدی جستجو غالب کا سب سے عظیم ورثہ ہے۔۔۔ وہ جس طرح نئی نسل کی افسردگی، تشکیک، کلبیّت اور شکست خوردگی میں شریک ہوتے اور سہارا دیتے ہیں اس طرح اردو کا کوئی دوسرا شاعر شریک نہیں ہوتا۔۔" (فروغ اردو لکھنؤ۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

پروفیسر محمد مجیب نے غالب کے کلام کے فکری پہلو یا فلسفیانہ آہنگ کا تانا بانا معلوم کر کے بتایا تھا کہ یونانی فلسفے، ایرانی تصوف اور ہندستانی ویدانت کے باریک تار اس شاعر کی انسانیت دوست نگاہ کے تارے مل گئے ہیں اور خوش بیانی نے انھیں سننے یا پڑھنے والوں کے لیے دل کش بنا دیا۔ پروفیسر سرور نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ جدیدیت (Modernity) سے غالب کا یہ گہرا رشتہ ہے کہ اس کی شاعری شروع دور سے ہی، سننے کے بجائے پڑھنے کی چیز ہے، دوسرے وہ کسی نظریے یا فلسفے کی پابند نہیں، تیسرے یہ کہ غور طلب ہے اور سوچنے پر اکساتے وقت وہ اپنی عظمت کا سکہ جماتی ہے۔ (مقالہ سمینار علی گڑھ۔ مارچ ۱۹۶۹ء) مذہبی خیالات کی مزید علمی وضاحت ہوتی ہے تیں تازہ ترین مقالہ سے: ایک پروفیسر عالم خوندمیری کا بیش قیمت مضمون "غالب کی ابتدائی شاعری، تلاش استناد کی ایک کوشش" وہ کہتے ہیں کہ ۲۵ برس کی عمر میں شاعر کو وجود کی ماہیت کا شاعرانہ وجدان ہوگیا تھا۔ تنہا غالب ہے جس نے "وحشت" میں وحدت کا راز پایا۔ "غالب کے نزدیک وحشت اور تمنا یا شوق میں ایک گہرا اندرونی ربط ہے۔۔۔ انھیں کائناتی تمنا کے مقابلے میں موجود کائنات محدود نظر آتی ہے اور اسی لیے وہ کائنات کو وسیع تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے شوق ایک عقیدے سے کم نہ تھا۔۔۔ یہی شوق اور تمنا ہے جو وجود کے ہر پیکر کو فردیت عطا کرتا ہے۔ فردیت کا یہی شدید احساس غالب کو تنہائی کے اضطراب سے دوچار کرتا ہے اور اس تنہائی کے احساس سے بے چین ہوکر

وہ اپنی شخصیت کو مستند یا authentic بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی پوری شاعری تلاش استناد کی ایک داستان ہے۔۔۔" (Urdu Blitz, 1st March 1969) ڈاکٹر وحید اختر بھی عالم خوندمیری کی طرح غالب کی فلسفیانہ جستجو کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب بیسویں صدی کے فکری میلان کے پیش رو اس لیے ہیں کہ مذہب، فلسفہ، سیاست، ادب، آرٹ، ہر شعبے میں ان کے ہاں تشکیک ہے۔ "غالب نے پے کو کسی عقیدے، کسی فلسفیانہ نظام یا کسی محدود تصور سے وابستہ نہیں کیا" اس لیے گزشتہ کل کے بعض نظریات اگر آج رد کر دیے جائیں تو غالب اپنی ناوابستگی (Unconformism) کی بدولت قبول کیے جائیں گے۔۔۔" وہ سب کے ہم نوا ہوتے ہوئے بھی سب سے آزاد ہیں۔"

ڈاکٹر وزیر آغا بھی فلسفہ اور مغربی ادبیات کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے بھی جدید ادبی تنقید کے معیاروں سے غالب کے شاعرانہ اسرار تلاش کیے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنے حالیہ دو مضمونوں میں غالب کی شخصیت کے اندرونی تصادم سے اس کی مقبولیت کا راز معلوم کیا اور اس کے ذوقِ تماشا کو اہمیت دیتے ہوئے بتایا کہ زندگی کے مختلف مظاہر کے لیے غالب ایسا تماشائی ہے جو تماشے میں شریک ہو کر، لطف اندوز ہو کر، رسے زنی کرتا ہے اور زیرِ لب مسکرا دیتا ہے۔ وہ ہجوم میں رہ کر بھی سب سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ (شاعر۔ غالب نمبر ۱۹۶۹۔ بمبئی)

صد سالہ جشن کے ضمن میں غالب شناسوں کے جو نام ابھرے ہیں ان میں پروفیسر رحمت حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، خورشید الاسلام، موسیٰ خاں کلیم، آفتاب احمد خاں، افتخار جالب، قدرت نقوی، شکیل الرحمٰن کے علاوہ اطالیہ کے لیکساندر بوسانی، لندن کے رالف رسل اور روس کی نتاشا پری گارینا بھی قابل ذکر ہیں۔ فکری نظریات کے اختلاف کے باوجود ان سب کی نظر اردو فارسی ادب کے اس تمام سرمائے پر ہے جو غالب کی آخری خاموشی کے بعد سے اب تک منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

رالف رسل اور خورشید الاسلام کی مشترکہ تالیف "(Ghalib: Life and Letters)" اگرچہ غالب کی مستند سوانح مرتب کرنے کی کوشش ہے، تاہم اس میں خطوط و اشعار کی مدد سے ایک نفسیاتی نکتہ حل کیا گیا ہے۔

اپنے اردگرد کے حالات، خواہشات، تمناؤں اور عقیدوں کی تشکیل میں اس شاعر کا برتاؤ بچپن سے ہی "بظاہر آشنا، بباطن بیگانہ" کے سانچے میں ڈھل گیا، عاشقی ہو یا شاعری دنیاداری ہو یا بے تعلقی، ہر عمل میں وہ "باہمہ اور بے ہمہ" رہتا ہے اور اسی برتاؤ کی ڈھال سے زندگی کی ناگواریوں کو گوارا کر لیتا ہے۔ یہ برتاؤ جو ۱۸۵۷ء "دستنبو" شائع کرتے وقت سامنے آیا، دراصل غالب کے بچپن سے ہی اس کے پورے وجود میں رس بس چکا تھا۔

تتاشہ پری گاریینا نے چند اہم علامتیں چن کر غالب اور اقبال کے ہاں ان کے تلازمے تلاش کیے اور یہ حیرانی ظاہر کی کہ اقبال جنھیں فکر و فن میں غالب کا وارث سمجھا جاتا ہے، غالب کے چراغ تمنا و جستجو سے روشنی تو ضرور لیتے ہیں لیکن اس سے ایک معاشرے، ایک محدود دنیا کی تاریکی دھونا چاہتے ہیں، ان کا علم غالب سے کہیں وسیع لیکن تخاطب غالب کے مقابلے میں نہایت محدود ہے۔

غالب کی ذہن اور اس کے فنکارانہ کمال پر مختلف خیالات رکھنے والوں نے پچھلے سو سال میں جو نکتے بیان کیے ہیں ان سب سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود اتنا ضرور ہے کہ ہر ایک پہلو سامنے آ جاتا ہے، اور غالب کا مطالعہ کرنے والے کو نہ صرف یہ کہ غالب کی نظم و نثر کی تمیز پیدا ہوتی ہے بلکہ وسیع پیمانے پر پرانی و نئی ادبی شناخت میں ذوق کو تربیت اور نگاہ کو وسعت بھی ملتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں زمانے کے مزاج و مذاق کی تبدیلی کو بہت دخل ہے اور خود شاعر کو اس تبدیلی کا کچھ کچھ احساس تھا۔ اگرچہ اس نے بعض اوقات مایوسی کا اظہار کیا لیکن زمانے کے تعلق سے جو آواز اس کی نظم و نثر پر حاوی ہے وہ استقبال کی ہے۔ وہ آنے والے زمانے کو نہیں کوستا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا ہے، وہ اپنے دکھوں، اپنے طبقے یا ہم وطنوں کی حالت پر کڑھنے اور طنز کرنے کے باوجود زمان و مکان سے بے تعلق یا بیزار نہیں ہوتا بلکہ سب پوشیدہ مکانات تک نگاہ پہنچاتا ہے۔ اور ہم کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ ایسے دیدہ ور صاحب نظر لوگوں سے رہنمائی حاصل کرو جو پتھر کے سینے میں چھپے ہوئے شرارے دیکھ لیں۔ (قصیدہ ۲۶۵۔ ردیف "ببیند") اگر انسان کی نگاہ گہرائیوں میں نہ اترے کہ حقیقت

کا سراغ نہ پا سکے، تب بھی اس حسنِ فطرت سے منکر نہ ہونا چاہیئے جو آنکھوں کو میسر ہے، ذوق و ذہن کو تازگی عطا کرتا ہے۔ مختصر یہ
انسانی زندگی میں آسائش و آرائش کی تلاش گناہ نہیں بلکہ جبر میں اختیار کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ زندگی اور فن
کے متعلق غالب تفکر کا قائل ہے۔ علوم میں معقولات (Natural Sciences) کی تحصیل پر زور دیتا
ہے، ہر ایک منظر پر آنکھیں کھلی رکھنے اور اس کی تہہ میں اترنے کو ذہنی آدمی (intellectual) کا فریضہ
قرار دیتا ہے، تاہم اس کا نقطۂ نظر عملی ہے حسن و عشق کے معاملات میں وہ انسانی فطرت کے اس المیے سے آگاہ
ہے کہ خواہشوں کی کثرت محرومی کا سبب بنتی ہے اور برق کی عبادت کرنے والا ہی پیداوار جل جانے کا افسوس کرتا ہے۔
حیات و موت میں بھی جبر و اختیار کی یہ کشمکش جاری ہے، یہ المیہ، یہ کشمکش، یہ اثبات و نفی کی دریپئی حالت اس کا
دل ضرور دکھاتی ہے، لیکن شوق، تمنا اور کوشش و کاوش سے اکتاتی نہیں، بلکہ ولولہ پیدا کرتی ہے۔ اگر زندگی
اور فن دونوں کے متعلق اس کا برتاؤ عملی اور اس کا اضطراب نتیجہ خیز نہ ہوتا تو اس قسم کے سیکڑوں اشعار اس کے
کلام میں اور خطوط میں جا بجا بکھرے نہ ہوتے:

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

گر بمعنی نہ رسی، جلوہ صورت چہ کم ست؟
خم زلف و شکن طرف کلاہ ہے دریاب

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے!
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیئے!

یہ عملی نقطۂ نظر اس کی نظم و نثر میں چند غیر معمولی خصوصیات ابھارتا ہے جنھیں ہم یوں شمار کر سکتے ہیں:

(۱) وہ انتہائی غم اور زبردست نشاط کے لمحوں میں بھی ہوش مندی سے ہاتھ نہیں دھوتا۔ ہر موقع پر لیے دیے رہتا ہے۔ "یک گونہ بے خودی" اس کی پالیسی (Policy) یا وقتی تدبیر ہے، کریڈ (Creed) یا ایمان نہیں۔ کوئی بھی ذہنی یا جذباتی عالم ہو، اپنے ادراکات کے وجود سے غافل ہو جانا اسے گوارا نہیں۔

رومانوی دور کے شاعروں کی افتادِ طبع کے خلاف وہ نہایت سنبھلا ہوا شاعر ہے۔ کسی کیفیت میں اسے بے قابو ہو جانا پسند نہیں، اپنی شاعری میں [دو تین شعروں کو چھوڑ کر] اور خطوں میں یہ وہ فضا قائم کرتا ہے کہ انسان کو شہد کی نہیں، مصری کی مکھی بننا چاہیے کہ لذّت تو حاصل کرے، اس لذّت میں ڈوب نہ جائے۔ غالب سے زیادہ کھل کر ۹ ویں صدی کے کسی شاعر نے یہ بات نہیں کہی:

در دہر فرو رفتہ لذّت نتواں بود
بر قند، نہ بر شہد نشیند مگس ما

(دنیا ایسی ہے کہ انسان کو لذّت یا عیش میں ڈوبنا نہیں چاہیے۔ ہماری مکھی شہد پہ نہیں مصری پر بیٹھتی ہے)

فنکار کو بھی اس کا کچھ ایسا ہی مشورہ ہے کہ اپنے باطن کو، اپنے فنی ضمیر کو منظرِ عام پر لاؤ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ قدم ڈگمگا جائیں، اپنی جگہ مضبوطی سے تھامے رہنا "چار انگاہ دار وہم از خود جدا برقص" ادب اور زندگی، دونوں کے بارے میں غالب کی یہ "خود نگری" "خودداری"، سنجیدگی، وزن، رکھ رکھاؤ، عزتِ نفس کا ماحول پیدا کرتی ہے۔

(۲) دنیا کے کئی عظیم شاعروں کی طرح غالب کی شاعری بھی ایک تاریخی دور کا 'وِژن' دکھاتی ہے۔ مختلف لفظوں میں اس نے خود بھی یہ اظہار کیا ہے کہ "کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے"۔ ـــــ زندگی کے حالات اور زندگی کی تمناؤں کا زبردست تصادم اس کے کلام میں دو رنگی دھاریاں ڈالتا ہے۔ اور ایک ایسے رومانوی یا تصوری ہیرو کا پیکر ابھارتا ہے جو روزمرّہ کی زندگی سے اوپر اٹھ کر کچھ خواہشوں، تمنّاؤں اور آدرشوں میں زندہ ہے۔ وہ غالب جسے امیروں کے آستانوں پر، شکستہ دربار کی ہلکی پھلکی محفلوں میں، گورنروں کی بارگاہ میں سر جھکا کر قصیدہ یا قطعہ پیش کرنے کی مجبوری درپیش رہی، روزمرّہ کی زندگی کے ہاتھوں بے بس اور موروثی عادات کے شکنجوں میں

جکڑا ہوا غالب ہے، اور وہ جو اپنے طرزِ بیان و طرزِ فکر میں نئی راہیں تلاش کرتا ہے، ذہنی آزادی کے گن گاتا ہے، فکر کو تلاش کی راہ پر رکھنے اور تازہ دم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے، اور اپنے زمانے کی کسی روش سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ اس کی تمناؤں یا آدرشوں کا تراشا ہوا پیکر ہے۔ پہلے وجود کو اس کے بزرگوں نے اور گھریلو حالات نے جنم دیا تھا، دوسرے وجود کو خود غالب نے اپنی تلاش، اور فکر و فن کی آمیزش سے تراشا ہے۔ غالب کا یہ تصوری وجود بھی اپنے لیے "میں" اور "ہم" کی ضمیر استعمال کرتا ہے، اور یہی مرزا اسد اللہ کا وہ نعم البدل ہے جسے نسلِ حاضر نے غالب کے کلام سے حاصل کیا۔

(۳) فارسی اردو شاعری کے ایک ہزار سالہ ادبی ورثے میں غالب سے بڑھ کر کسی نے "عقلیت" پر زور نہیں دیا۔ جرمن فلسفی کانٹ کے "Pure Reason" (عقلِ محض) کی اطلاع غالب کو نہیں تھی، لیکن عقلیت، استدلال، احساسِ تناسب یا خورد و فکر کو ہمارا شاعر زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہوئے بھی اُسے جذبات سے عاری قرار نہیں دیتا۔ وہ انسانی عقل کو "اندھیری رات کا چراغ"، اور "جذبات کو قابو میں رکھنے والی قوت" ٹھہراتا ہے اور اس کے حصول پر زور دیتا ہے۔

عقلیت پر زور دے کر، جہاں وہ ایک طرف قدیم نظامِ زندگی سے بےپناہ جذباتی رشتہ توڑنے کا اعلان کرتا ہے، وہیں ایک ایسی زندگی کا طلب گار ہے جس میں انسان سربلند ہو، پستی میں کھو کے ننگے نہ ہوں، تعصب یا تنگ نظری کا ماحول نہ رہے اور آدمی میں عزتِ نفس کا جذبہ قوی ہو۔

غالب پہلا شاعر ہے جس نے خرد، غم اور آرٹ کا پوشیدہ رشتہ تلاش کیا۔ غم وہ گہری اُداسی جو آرزوؤں کی پے در پے شکست سے اور دکھوں بھری دنیا کے بھرپور مشاہدے سے انسانی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ خرد، وہ علم و تلاش کی قوت جو عالمِ اسباب کے مظاہر (Phenomena) میں رہ کر ان کے امکانات کا پتہ لگاتی ہے، حالات سے نمٹنے کی تدبیر بتاتی ہے اور خواہشوں کو قابو میں رکھ کر تناظر (Perspective) کا تناسب دکھاتی ہے۔ شاعری، موسیقی یا مصوری، انسانی فن کی یہ زبان ... جو آرٹ ہے، خرد و غم سے مل کر

ایک "مثلث بناتی ہے۔ اسی کو فکر اور جذبے کی آمیزش کہا گیا ہے۔ غالب کے آرٹ میں، خود آرٹ کا یہ تصور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ "دلِ دردمند" اور "خرد خوردہ بیں" دونوں اس ترازو میں ہم وزن ہیں۔ غالب کے ہاں Rational کے ساتھ irrational کی بھی اہمیت ہے۔ غم اگر عشق کا نہ ہوتا تو روزگار کا نہ ہوتا، دل اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا Rationalism روشنی دکھاتا ہے، رہنمائی کرتا ہے، لیکن آگے نہیں لے جاتا، اس کے لیے عشق کی دردمندی چاہیے اور تمناؤں کی وہ بے چینی جو صورتِ حالات میں تھک کر نہیں بیٹھ رہتی۔ آرٹ محض جذبے یا فکر کا اظہار نہیں ـــــ خوب صورت، دل کش اور دلوں میں اتر جانے والا اظہار ہے جو مخاطب کو بھی کہنے والے کی آنچ میں سینک دے، اور ذہنی کیفیت میں شریک کرے۔

آرٹ میں بھی اس کی "عقلیت" اپنا کام کرتی ہے اور اسے لفظوں کے حسن و کشش میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے۔ وہ خوب صورت لفظوں کے طلسم میں گرفتار نہیں ہوتا، لفظوں اور بندشوں کو وزار کی طرح قابو میں رکھتا ہے اور حسبِ منشا کام لیتا ہے۔

(۴) غالب نے اپنے زمانے میں رائج تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ معاصرین کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف کے مختلف نظریوں، اصطلاحوں اور مسائل پر غالب کی بہت گہری نظر تھی، وہ عمر اور علم کے مختلف درجوں میں موت و حیات، جبر و اختیار، خالق اور مخلوق کے بارے میں اپنی رائے بھی بدلتا رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس مقام پر آکر ٹھہرا جہاں تصوف ایک مابعد الطبیعیاتی (metaphysical) عقیدہ بننے کے بجائے ایک اخلاقی برتاؤ رہ جاتا ہے۔ اس نے تصوف کے مسائل میں سے، انسانی روح کا درد، تمام موجودات کی حقیقت کا ایک ہونا، مایوسی یا بیزاری کو صبر و رضا سے بدل دینا، تمام انسانوں کو ایک برادری شمار کرنا، اپنے اور غیر، خالق و مخلوق کے درمیان فرق اٹھا دینا اور مذاہب کے اختلافات سے، نفرت و حقارت سے ہاتھ دھو لینا اپنے لیے انتخاب کر لیا۔ تصوف کو غالب نے اس کی قدیم فلسفیانہ بحثوں اور مقررہ رسموں (Rituals) سے نکال کر اپنا ایک اخلاقی پیرایہ بنا لیا اور وحدۃ الوجود کے نظریوں کو نقاب کی طرح نہیں بلکہ چھتری کے طور پر استعمال کیا، ورنہ شعروں اور خطوں میں یہ خیال بار بار کیوں آتا ہے۔

بر آر از بزمِ بحث اے جذبۂ توحید غالبؔ را
کہ تُرکِ سادۂ ما با فقیہاں بر نمی آید

(۵) تصوّف کی جس روح کو شاعر نے پنایا ، وہ مخلوق کو خالق کا پرتو مان کر بھی فرد کی قدر و قیمت سے آگاہ ہے ،
یہاں بھی اسی قسم کا تضاد نظر آتا ہے جیسا دنیا کے روپ کو بے حقیقت سمجھنے کے بعد اس روپ سے دل لگانے کی کوشش یا خواہش۔
فرد کی حیثیت اور اس کی سربلندی غالبؔ کی شاعری میں پوری طرح ابھر کر آتی ہے اور انسان کی عظمت کا ترانہ بن جاتی
ہے۔ وہ انسان کو پوری کائنات کے دائرے کا مرکزی نقطہ سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ دنیا کی رونق انسان کے دم سے ہے۔
مٹی کی یہی مورت پورے عالمِ فطرت کی "غرضِ آفرینش" ہے اور یہی ہے جو بے معنی اگنے والی چیزوں میں ترتیب و تنظیم
قائم کر کے اس سے آرائش اور آسائش کا سامان مہیا کرتی ہے۔ انسان کا وجود ایک نعمت ہے۔ اس وجود پر دکھوں
اور حسرتوں کا اتنا بوجھ ہے جس کے سامنے گناہ کا تصور اور گناہوں کی حیثیت کچھ نہیں۔

دم از وجودِ ذنب زنند بے خبراں
چرا عطیۂ حق را گناہِ ما گویند؟

تصوف کی رسمی عبادتوں اور ما بعد الطبیعیاتی بحثوں سے بلند ہو کر غالبؔ نے جہاں فطرت کے حسن
کو نظر میں تولا ، وہیں انسان کو خدا کے سامنے سربلند پیش کیا ، اس کی گردن سے مفروضہ گناہوں اور خوف و دہشت کی دلدل
کا بار اتار لیا۔

وہ فارسی اردو کی تمام شاعری میں پہلا شخص ہے جس نے اپنے عمل کا حساب
دینے کے بجائے ، خدا سے انسان کی حسرتوں کا حساب طلب کیا ہے اور کھلے لفظوں
میں انسان کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔

غالبؔ کی تمام اردو فارسی شاعری میں انسانی عظمت ، خودداری اور سرکشی و سربلندی کی روح سنگین ترشے ہوئے
پیکر میں شرر کی طرح بیتاب ہے۔

(۲) غالبؔ اپنے ادگرد کی دنیا کو ہی نہیں، خود اپنے عمل کو بھی تنقید کی کسوٹی پر رکھتا ہے۔ ساٹھ برس کے طرزِ فکر در رنگِ سخن کو نظر میں رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کے ہاں دنیا کے مفکر بالقلم کی طرح تخلیقی عمل ہی تنقیدی عمل بنتا گیا ہے۔ اس نے ہر زمانے میں یقین کو شک کی جان لیوا سرنگ سے گزارا، اور حقیقت کی تلاش پر کسی عقیدے کا اجارہ تسلیم نہیں کیا، آدمی اور اس کے مسائل پر حقیقت، وراثت دکے خلاف پر جتنی اس کی نظر گہری ہوتی گئی، وہ اپنی انوکھی روش سے روشِ عام کا فاصلہ کم کرتا گیا، دشواری سے سہل بیانی کی طرف، بیزار کے سے اُنس کی سمت، در پیچیدگی سے سادگی کی جانب بڑھتا گیا۔

عمر اور تجربے کی آخری پختگی کو پہنچتے پہنچتے غالبؔ نے نہ صرف یہ کہ اندازِ بیان کو عام پسند سانچوں میں ڈھالا بلکہ عام زندگی کی کھُردری اور بظاہر غیر شاعرانہ حقیقتوں اور حالتوں کو چن کر اپنی شاعری کا موضوع بنایا، سڑکوں اور گلیوں میں پڑی ہوئی باتوں سے شعر تراشے اور انھیں زبان و بیان کی سادگی و نرمی عطا کی کہ اس کے تقریباً دو سو شعر اور مصرعے دلوں میں اتر گئے اور زبانوں پر چڑھ گئے۔

اس قسم کے خیالات کو غالبؔ سے پہلے شاعری کا موضوع نہیں سمجھا گیا تھا ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

— یا —

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

روزمرہ کی بظاہر معمولی سی باتوں کو شاعرانہ حسنِ بیان دے کر غالبؔ نے روزمرہ کی زبان کا حصہ بنا دیا اور جب غالبؔ کے یہ تقریباً دو سو شعر اور مصرعے زبان کا جزو بدن بن چکے، تب غالبؔ کے اس کلام کی طرف توجہ ہوئی جو مذاقِ عام سے

بالکل ہٹا ہوا اور دشوار گزار تھا۔

ادب کے ذوق کی شل، خود غالب کی شاعری بھی مقبولیت کے کئی درجے رکھتی ہے۔ مگر ایسا حصہ بہت کم ہے جسے بالکل ہی عام لوگوں تک رسائی حاصل ہوئی، اس سے کچھ زیادہ وہ کلام ہے جو درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ ذوق کی تربیت کرتا ہے اور درسی و اردو کا کم سے کم مشہور کلام ایسا ہے جو علاوہ درجے کا ادبی ذوق رکھنے والوں میں عام ہو چکا ہے، اور عام ہوتا جاتا ہے۔ یہی وہ حلقہ ہے جو غالب کے نازک، باریک اور دشوار شعروں سے اپنے علمی و ادبی ذوق کو صیقل کرتا اور غالب کے اشعار سے الفاظ و تراکیب نکال کر اپنے ہاں سجاتا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں پچاس سے زیادہ ادبی کتابوں کے نام غالب کے کلام سے چن کر رکھے گئے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۰) کچھ عرصے سے اردو کے ادبی حلقوں میں ایک رَو چلی ہے غالب کو عہد حاضر کا شاعر کہنے کی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ غالب نے انفرادیت، تشکیک اور فرد کی تنہائی کو ادبی لہجہ عطا کیا۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی شاعری انسان کو اس کے پھیلاؤ یا حد نظر میں، افق تا افق ہی نہیں دیکھتی بلکہ اس کی گہرائی میں بھی اترتی ہے۔ تینوں فاصلوں (Three Dimensions) میں آدمی کے وجود اور مسائل کی تلاش ہر زبان کی بڑی شاعری کا وصف رہا ہے، غالب کے ہاں یہ وصف بہت نمایاں ہے۔ وہ آدمی کے باطن کو ایسی کتاب پاتا ہے جس کے ورق بھی نہیں الٹے گئے "ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ"، ورنہ تنہائی میں بھی وہ تنہا نہیں رہتا بلکہ خیالوں اور فکروں کا طوفان برپا رکھتا ہے "ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو"۔ "ہیملٹ" میں ڈنمارک کے شہزادے کی طرح ذہن کی بیداری وجود کی بے قراری بنی رہتی ہے ؎

رشک ہے آسائش اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

غالب اس الجھی ہوئی دنیا میں فرد کو بے بس دیکھنا قبول نہیں کرتا بلکہ زندہ رہنے کے جتنے امکانات ہیں ان پر اس کی نظر ہوا کرتی ہے۔ حیات کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھتا ہے اور زندگی کے ہر منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

۱

"انفعال" یعنی اثر پذیری اور بے بسی اُداسی کو وہ انسان کی زندہ رہنے کی امنگ کے خلاف جانتا ہے اسے "ہنگامۂ زبونی ہمت" قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے غالبؔ کی آواز ان وجودی (Existentialist) فلسفی ادیبوں سے مل جاتی ہے جو مذہبی عقائد کی رہنمائی و ماضی و مستقبل کے دونوں پاٹوں سے بے نیاز ہو کر موت و حیات کے رشتے کی تلاش حال میں کرتے ہیں۔

غالبؔ نے خیامؔ اور حافظؔ دونوں سے آگے جاکر "نہاں خانۂ دل" میں نقب لگائی اور فرد کے باطن کی گہرائی کو چھوا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں "آدمی نہیں، آدم شناس ہوں" (۱۸۶۴ء، کا خط بے خبر کے نام)۔ یہ بتایا کہ "آدمی عموماً اور صاحبان ننگ و ناموس خصوصاً، باوجود فراغ معاش ایسی جاں گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے!" غم صرف روٹی کی فکر کو نہیں کہتے۔ وہ اس سے بہت گہری کیفیت ہے۔ غم انسان کے باطن کی صفائی اور کردار کی خوبی کے لیے ضروری شرط ہے۔ ان پہلوؤں کو نظر میں رکھنے کے بعد بھی غور طلب نکتہ یہ ہے کہ غالبؔ کے اشعار مفہوم کی کئی تہیں رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کے اپنے رجحان پر بھی موقوف ہے کہ وہ کسی شعر کو کس مفہوم کے ساتھ کھولنا چاہتا ہے۔ محض شخصی، نفسیاتی، فکری، سماجی یا سیاسی سطح پر ـــ یا بیک وقت کئی سطحوں پر ان سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر جو لوگ اردو کے حرف سے واقف نہیں، وہ بھی یہ شعر پڑھتے ہیں:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

بظاہر سامنے کی بات ہے، اس لیے عام زبانوں پر چڑھ گئی۔ کسی انجمن میں یہ شعر اپنی اوپر کی تہہ کھولتا ہے۔ پھر دل کی نادانی "دردِ تنہائی" کے عذاب میں گرفتار ہو کر بھی اس شعر کو اپنے اوپر طاری کر سکتی ہے۔ فرد کا سماج سے اجنبیت محسوس کرنا (Alienation) بھی ایک "درد" ہے جس کی دوا دل ناداں کو نہیں ملتی۔ تخلیق کا کرب بھی ایسا درد ہے جس کی دوا بعض اوقات نہیں پائی جاتی، جینے کی امنگ، و موت کا جبر بھی ایک "درد" ہے اور عظیم الشان سلطنت یا تہذیب کے ٹکڑے اڑتے دیکھنا بھی "درد" اٹھاتا ہے جس کی دوا "دل ناداں" کو نہیں معلوم۔ غرض جتنے اور قسم کے درد ہوں گے اتنے ہی پہلوؤں سے اس معمولی سے عام پسند شعر کو سمجھا جاسکے گا۔ مشکل و رباریک شعروں میں یہ تہہ در تہہ کیفیت

اس قدر ہے کہ بعض اشعار کو شارحین نے اپنے اپنے طور پر سمجھا کر آٹھ، نو مطلب نکال لیے ہیں۔

قوسِ قزح کی سی اسی رنگا رنگ کیفیت نے (جس کا احساس خود شاعر کو بھی تھا) غالب کے کلام کو متضاد فکری، ادبی حلقوں میں مقبول بنایا ہے اور تلاش کی ترغیب دلائی ہے۔

(۸) غالب کے کلام کا بڑا حصہ ایسا ہے جس میں "اداسی" یا "درد" کو اتنا ہی پایا جا سکتا ہے جتنا مسرت اور شگفتگی کو — سوچ کی سنجیدگی نے شاعر کے لہجے میں جو ایک متانت اور وقار پیدا کیا ہے اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غم کا عنصر غالب کے ہاں حاوی ہے لیکن غم کو جس جس پہلو سے دیکھا جائے میر تقی میر یا میر درد کے کلام میں غالب سے بھی زیادہ ہے

غالب کے ہاں غم اور رنج یا درد ہم معنی نہیں ہیں۔ اس کے کلام میں شگفتگی کا لہجہ زندہ دلی کی لے، شوخی اور مسکراتا ہوا طنز محض ایک نقاب نہیں بلکہ زندگی کے برتاؤ اور شخصیت کے سبھاؤ کی حیثیت سے نشاط کی کیفیت میں گھل مل گئے ہیں۔ آنسوؤں کو طنزیہ تبسم بنانے میں غالب کی فنکاری کا راز کھلتا ہے۔ غالب کھلنڈروں اور بے فکروں کی طرح قہقہہ نہیں مارتا، وہ اپنے زمانے پر بھی طنز کرتا ہے، اس کی عادت پر بھی، اس کے اداروں اور اہم شخصیتوں پر بھی اور خود اپنے آپ پر بھی۔ وہ سودا یا انشا کی طرح افراد یا حالات کا مذاق نہیں اڑاتا، خیام و حافظ کی طرح چھیڑ خانی کرتا ہے اور ان دونوں سے زیادہ بیباک اور دو ٹوک لفظوں میں، وہ شکایت یا افسوس نہیں کرتا، بے نیازانہ کٹیلے طنز سے درد کو احتجاج بنا دیتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے !

— یا —

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ا

اس لب ولہجے میں غالب کو اردو کے دوسرے شاعروں سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

خود غالب کے بقول وہ سینے میں غم چھپا کر اسے تبسم میں ڈھالنا جانتا ہے۔ عام و خاص، دانا اور نادان دونوں پر ہنستا ہے — اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی زندگی اور آدرشوں کے تضاد پر، اپنے حالات اور تمناؤں کے بے جوڑپن پر، عقل اور خواہش کے تقاضوں کی کش مکش پر غالب ہی سب سے زیادہ ہنستا اور ہنساتا ہے۔

(۹) غالب کے کلام میں "صوتی آہنگ" لفظی حسن اور آوازوں سے ابھرنے والی تصویروں کا ایسا نگار خانہ سجا ہوا ہے جس کی طرف حال میں توجہ کی گئی ہے۔

شروع میں اس کے ہاں ج، ژ، ش کی آوازوں کی کثرت تھی اور فارسی شاعری کا پر شوق لہجہ طاری تھا، پھر د، ت، س کی آوازیں بڑھتی ہیں اور آخری پندرہ سترہ سال کے کلام میں نرم غنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ن، م، ر، س کی آوازوں کی تکرار ہوتی ہے۔ گہری فکر انگیز اور قریب المخرج آوازوں کی جگہ نرم موسیقی لیتی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں کلاسیکی مثنویوں کی بحریں چھوڑ کر باقی ۳، ۴ بحروں کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور یہ وہی بحریں ہیں جو "شش مقام" کی عام پسند موسیقی میں رنگ لاتی ہیں اور ہند ایرانی موسیقی سے میل کھاتی ہیں مثلاً مفعول، فاعلات، مفاعیل فاعلن / مفتعلن، مفاعلن مفتعلن مفاعلن / مفاعلات مفاعیل، فاعلن، فعلن / مفعول، مفاعیلن مفعول مفاعیلن / فاعلات اور مستفعلن کو عموماً زحافات کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ فارسی اردو میں بمشکل دس غزلیں ایسی ہیں جن کی بحریں ہندستان میں گائی جانے والی بحروں کی موسیقی سے کسی قدر ہٹ گئی ہیں۔ مثلاً "قرار نہیں ہے"، "قدم آگے"، "لرزد"، "چہ غمستے" کی ردیف والی غزلیں۔ غالب نے مقررہ بحروں میں زحاف کی کمی بیشی کر کے صوتی آہنگ کا انوکھا تجربہ کیا، اور دیکھ لیا کہ ایسا کلام زبانوں پر عام نہیں ہو سکا۔

(۱۰) غالب نے اپنے کلام کا صرف انتخاب ہی شائع کیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ اس مجموعے سے باہر جو ملے اُسے میرا کلام شمار نہ کیا جائے۔ اس انتخاب سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ پہلے کے لکھے ہوئے اشعار میں دونوں سمت سے

ا

اصلاح کی گئی ہے۔ ایسے لفظوں کے ذریعے جو ادائے مطلب میں مدد دیں اور ایسے مصرعوں یا ترکیبوں سے جو خیال کی ڈور تھامنے کے علاوہ زبان سے ادا کرنے پر بھی اچھے معلوم ہوں۔ لفظوں کی تراش اور مصرعوں کی مجموعی آواز میں بھی غالبؔ ایک اعلا درجے کا فنکار نظر آتا ہے۔

ایک نکتہ اور اسی ضمن میں اُبھرتا ہے: اردو کے کسی شاعر کے ہاں اتنی غزلیں یکجا نہیں ملتیں جو اوّل سے آخر تک منتخب اشعار کا مجموعہ ہوں یا جن میں اوّل درجے کے اشعار ایک ہی غزل میں اس طرح چُنے ہوئے ہوں کہ خیال ایک ہی کیفیت کے مختلف پہلوؤں یا مرحلوں کا لطف لے سکے۔ ان میں باطنی رشتے کے علاوہ آوازوں اور لفظوں کا بھی حُسن ہموار نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ جہاں دوسرے اساتذہ کے صرف چُنے ہوئے شعر یادوں میں محفوظ رہ گئے ہیں، غالبؔ کی سادہ، رواں اور عام فہم غزلوں بلکہ قصیدوں اور قطعوں کے بھی کئی ترتیب وار اشعار زبانوں پر رواں اور ذہن نشیں ہوئے ہیں اور ادبی ذوق کے مختلف درجوں میں الگ الگ لطف دیتے ہیں۔

غالبؔ کے شعر کا طلسم کھلتا ہے شاعر کے بہاؤ کو سمجھنے سے۔ وہ زندگی اور فن دونوں میں بہت واضح طور سے اپنا برتاؤ جتاتا ہے۔ یہی برتاؤ اُدھ کھلا باطنی رشتہ ہے جو وقت کے ساتھ ابھرتا اور نکھرتا رہا ہے۔ اس کے کلام کے درمیان جو شعر اس زندہ، بیقرار، شگفتہ، شاداب، آرزومند وجود کے برتاؤ سے میل نہیں کھاتے وہ صرف لطفِ سخن کی خاطر یا کسی رواں دواں لمحے یا اتفاقی خیال کو لفظوں کی گرفت میں لانے یا محض تجمّل کی خاطر کاغذ تک اُتر آئے، وہ اس بھری پُری محفل میں وقتی حاشیہ نشینوں یا نیازمندوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

"با کارم و بیکارم چوں مد بہ حساب اندر"

غالب کی مقبولیت کا راز اسکی فنی بصیرت میں ہے اور ادبی بصیرت کے سارے قدیم و جدید کی آویزش و آمیزش میں تہ در تہ سپے گئے ہیں۔ غالبؔ نے کیا معنی آفرینی اور کیا لفظ تراشی، دونوں سمتوں سے فارسی اردو کی دبی روایت پر ..... کا ... جم عمل کیا ہے، اور ردّ و قبول کے اسی بے رحمانہ عمل نے ہی اس کی شاعری کو توانائی اور تازگی بخشی ہے۔ ••

انتخاب
کلام اردو

ا

ا

غزلیات

۱

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عنقا ہے، اپنے عالمِ تقریر کا

۱

بس کہ ہوں، غالبؔ، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

۲

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اسدؔ، ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا

۳

جُز قیسؔ، اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

تھا، خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

۴

کہتے ہو: "نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا"
دل کہاں کہ گم کیجے؟ ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

۴

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر، یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے: "تم نے کیا مزا پایا؟"

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم، یارب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

۵

شوق، ہر رنگ، رقیبِ سروساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا، غالبؔ
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

۶

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس، جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

۷

نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۸

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں، اِک دیدۂ بے خواب تھا

۹

نہ ہوگا، یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے، نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا

۱۰

پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلتیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو، حُسنِ تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکاتِ حُسن دے، اے جلوۂ بینش، کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر
رہا، مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

۱

نہ دے نامے کو اتنا طول، غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جُدائی کا

اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا

۱۱

یک قدم وحشت سے، درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا
پوچھ مت رُسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیے، اوراقِ لختِ دل، بہ باد
یادگارِ نالہ، یک دیوانِ بے شیرازہ تھا

۱۲

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب، بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم، سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تادمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے، کیوں، اس کو وفادار، اسدؔ؟
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۱۳

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

۱

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوام، کلفتِ خاطر ہے، عیشِ دُنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں، خندہ ہائے بے جا کا
ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے، ہر بُنِ مو، کام چشمِ بینا کا
دل اُس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے، دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا
فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد، اسد
جفا میں اس کی، ہے انداز کار فرما کا

۱۴

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے، ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے، خامہ بیدلؔ کا

۱۵

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا
زیارت کدہ ہوں، دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

بصورتِ تکلّف، بمعنی تاسّف
اسدؔ میں تبسّم ہوں پژمردگاں کا

۱۶

آئینہ دیکھ، اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غُرور تھا!

۱۷

لطافت، بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں، خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

۱۸

غافل، بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں، طُرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ
صیدِ زدام جستہ ہے، اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گُناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے
پُرگل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا

۱۹

رشک کہتا ہے کہ "اُس کا غیر سے اخلاص حیف!"
عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"

شوق، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دستگاہ، و قطرہ دریا آشنا

سَو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

۲۱

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیَسّر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
دَر و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ، ازبسکہ، تقاضائے نِگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّائے نشاط
تُو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنّا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۲۲

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف، داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

وائے! اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے، اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

۲۳

قطرۂ مے، بسکہ حیرت سے نفَس پرور ہوا
خطِ جامِ مے، سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

۲۴

دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں، تجھ کو دکھاتا، ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

مَیں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

خود پرستی سے، رہے باہم دِگر نا آشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

رَبط یک شِیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

۲۰

یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار، باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مَے، کِسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط اَیاغ کا

بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے، نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں، دُودِ چراغ کا

۲۵

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنّا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گُم گشتہ، مگر، یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

مَیں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۶

تُو دوست کسی کا بھی، ستمگر نہ ہوا تھا
اَوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا، مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے
خُرشید، ہنوز، اُس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمّت ہے اَزل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالَم
مَیں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

مَیں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خُشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۲۷

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے — رفوئے زخم کرتی ہے بہ نوکِ نیشِ عقرب ہا
اسدؔ کو بُت پرستی سے غرض دردآشنائی ہے — نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی، اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر، اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

۲۹

سرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

۳۰

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئنہ، تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

۳۰

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اِس رہ گزر میں، جلوۂ گُل، آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی، کش مکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

احباب، چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی، خیال بیاباں نَوَرد تھا

یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

۳۲

محرم نہیں ہے تُو ہی، نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تُو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز!
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط، ہے سَر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ
سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

۳۳

دوست، غم خواری میں میری، سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور، کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماویں گے "کیا؟"

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر، میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت، اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے، کھاویں گے کیا؟

۳۴

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا
دل ہوا، کش مکشِ چارۂ زحمت میں، تمام
مٹ گیا، گھسنے میں، اس عُقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ، اللہ!
اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے، گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا!
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

ق

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا، غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وَا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

۳۵

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ، اِک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشا، تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے، میرے درباں کا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ، گویا، حُجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا!
قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۳۶

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک، اے سراپا ناز، "کیا، کیا"؟

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟
سن، اے غارت گرِ جنسِ وفا، سن!
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟
دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ "انا البحر"
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے؟ میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟
یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں؟

یہ، کافر، فتنۂ طاقت ربا کیا؟
بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا؟

۳۷

مَیں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
درماندگی میں، غالبؔ، کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کُشا تھا

۳۸

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو، ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

۳۹

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا؟
تم سے بیجا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلہ

اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں

کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے، ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد

ہاں، کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟

بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی!

گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا

نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام

ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

عشق میں ہم ہی نے ابرام سے پرہیز کیا — ورنہ جو چاہیے، اسبابِ تمنا سب تھا

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا [۴۰] — دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو، غالبؔ
کہتے ہیں: "اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا"

۴۱

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بَن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب؟
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اِک بُلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے اِدھر ہوتا، کاشکے، مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں، اُن کو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مِٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے، ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہُنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا، غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

۴۲

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تُو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح!
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۴۳

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں، تو کیا ہوتا؟

ہوئی مُدّت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ "یُوں ہوتا، تو کیا ہوتا؟"

۴۴

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا
رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا
اِس تکلّف سے کہ گویا بُت کدے کا در کھُلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟
آستیں میں دَشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھُلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اِک در ہے، میری گور کے اندر کھُلا

مُنہ نہ کھُلنے پر، ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنہ پر کھُلا

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا!
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

۴۵

جَور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں، "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا؟"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یا رب، اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

۴۶

درد مِنّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟
تُو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟
لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
"آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا"

۴۷

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا، نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
کم نہیں، نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے، وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے، جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

۴۸

بہ مُہرِ نامہ جو بوسہ گِل پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا؟
کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا

۴۹

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ، ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

۵۰

پھر وہ سُوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

۵۱

عیب کا دریافت کرنا ہے ہُنرمندی، اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطّلع، کامل ہوا

۵۲

اسدؔ، اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے ــ رُوٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر مَن گیا
خوشی جینے کی کیا، مَرنے کا غم کیا ــ ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا
پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی ــ روزن کی طرح، دید کا آزارہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر ــ آیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

پھر ہُوا وقت، کہ ہو بال کُشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہَوا موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہُوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر رُوحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گُل!
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

۵۴

عمر میری ہو گئی صَرفِ بہارِ حُسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ وسالِ عندلیب
ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر، کارِ اسدؔ
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

ع دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

۵۵

افسوس، کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

۵۶

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

رہے، غالبِ خستہ، مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے، حضرت سلامت؟

۵۷

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے، پر، کس وقت

۵۸

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

ق

غیر یُوں کرتا ہے میری پُرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست

تا کہ مَیں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے، پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

۵۹

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

۶۰

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج،

۶۱

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے، انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

۶۲

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

۶۳

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھُٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و اَدا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بُتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مےَ مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بےکسئ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

تھا مَیں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرّق ہوئے میرے رُفقا میرے بعد

۶۴

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
اے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند!
بالیدگی نیاز قدِ جانفزا است   در ہر نفس بقدرِ نفس ہے قبا بلند

۶۵

بلا سے ہیں، جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں، بال و پَر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و دَر، در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

۶۶

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام "ستمگر" کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سَر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پُوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافَر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گُفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں مَیں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

٦٧

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خُونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن، عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زُنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا مَیں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۶۸

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اِک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہُوا اگر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

۶۹

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سُبک دَست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دَم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رَواں اور

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے ٭ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ستم کش مصلحت سے ہوں، کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

۷۰

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیّر آبِ برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر

۷۱

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
"کہ مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

۷۲

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا، کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

مدعی، میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا، زشت رویوں کا عتاب آئینے پر
دل کو توڑا جوشِ بیتابی سے، غالب کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینے پر؟

۷۴

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

۷۵

حریف مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

۷۶

کیوں کر اس بُت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

""

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکُل!
مَیں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا
مَیں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز!

۷۸

ہجومِ فکر سے دِل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

۷۹

گُل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

۸۰

مژدہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
مَیں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اِک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل

نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن، بس کہ نمو کرتا ہے

خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے!

بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

سنینِ عمر کے ستّر ہوئے شمار برس بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

۸۱

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق

نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

۸۲

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع

ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی

یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پَرفشانیٔ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

۸۳

چار سُوئے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے
عقل کے نقصان سے اُٹھتا ہے خیالِ انتفاع

آشنا، غالبؔ، نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع؟

۸۴

بَد تراز ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ
خانۂ بُلبل، بغیر از خندۂ گُل، بے چراغ

پتّہ پتّہ اب چمن کا انقلاب آمودہ ہے
نغمۂ مرغِ چمن زا، ہے صدائے بوم و زاغ

چشم پُرنم رہ، زمانہ مُنقلب ہے اے اسدؔ اب یہی ہے بس، نہ ہُو شادی سے پُر ہونا ایاغ

جلتا ہے دل، کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف!

۸۶

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چُنتا تھا نمک

اِس عمل میں عیش کی لذّت نہیں ملتی اسدؔ
زورِ نسبت مَے سے رکھتا ہے نصاریٰ کا نمک

۸۷

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خُونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن!
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

۸۷

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۸۸

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مُدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خُدا نہ مانگ

۸۹

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ ہوائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹُوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خُونیں نوائے گُل

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو

رکھتا ہوں مثلِ سایۂ گُل سر بہ پائے گُل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطرسائے گُل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خُوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو　　جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

۹۰

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

۹۲

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زُلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم

۹۳

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم
اسدؔ، شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

۹۴

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں
تھی وہ اِک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں
مَیں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

۹۵

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھّوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجُود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نُما کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۹۶

ممکن نہیں کہ بھُول کے بھی آرمیدہ ہوں
مَیں دشتِ غم میں آہوئے صیّاد دیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
مَیں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ وَرَع کے حلقہ میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں مَیں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جسطرح اسؔد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا، عبث — پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج — مَیں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

۹۷

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخم سوزن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

۹۸

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں درپسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں؟

مَیں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تُو، اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے، ہے خدانہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں

۹۹

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت
مَیں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟

۱۰۰

مت ہو جیو اے سیلِ فنا اُن کے مقابل
جاں بازِ الم، نقش بہ دامانِ بقا ہیں

اے وہم طرازانِ مجازی و حقیقی
عشاق فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں

اب منتظرِ شورِ قیامت نہیں، غالب — دُنیا کے ہر اک ذرّے میں سو حشر بپا ہیں

۱۰۱

ہم سے کُھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اَوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دَھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

۱۰۲

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گُماں نہیں
اِک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا
پرسِش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہَل مِن مَزِید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاَمان نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سَرنوشت میں"
گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۱۰۳

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دَوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں"

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا، غالبؔ!
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

۱۰۴

اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویِ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

۱۰۵

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

۱۰۶

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
ترے سروقامت سے اِک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

جس دن سے کہ ہم غمزدہ، زنجیر بپا ہیں کپڑوں میں جوئیں، بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

مَیں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

مَیں اور حظِّ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

۱۰۸

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اِتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیٔ بُوتراب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لُوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو میں"

جانا پڑا رقیب کے دَر پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

ہے کیا، جو کَس کے باندھیے میری بَلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اِک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھُول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دِن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دِل پذیر متاعِ ہُنر کو میں

۱۱۰

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

ظُلم کر ظلم! اگر لطف دریغ آتا ہو
تُو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

مَیں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کِس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حُور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حُجّت ہے کہ مشہور نہیں!

۱۱۱

نالہ جُز حُسنِ طلب، اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامئ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

سُنبلِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیّاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کُوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے وَلے، اِس قدر آباد نہیں

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہرئ یارانِ وطن یاد نہیں!

۱۱۲

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

۱۱۳

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

۱۱۴

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد، یاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد، یاں

۱۱۵

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں، اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گُہر کو دیکھتے ہیں

۱۱۶

نہیں، کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دِل کہ شاد نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ؟
یہ کیا؟ کہ تم کہو، اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

۱۱۷

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہَوا باندھتے ہیں

آہ کا کِس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اِک اپنی ہَوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمُر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوُباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۱۱۸

دائم پڑا ہوا ترے دَر پر نہیں ہوں مَیں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں مَیں

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دِل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں مَیں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۱۱۹

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

واں گیا بھی مَیں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۱۲۰

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دِل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

دِل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے دشمنی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۱۲۱

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز
دلے بدستِ نگارے نداده رکھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے، بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

۱۲۲

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

اسدؔ زندانیٔ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

۱۲۳

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گزر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و دَر میں خاک نہیں

ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

۱۲۴

دَیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنّا
وَاماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

دِرم و دَام اپنے پاس کہاں!
چیل کے گھونسلے میں، ماس کہاں!

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دَیر نہیں، حرم نہیں، دَر نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں
جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنہ چھپائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں
حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں
واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بُلائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا! کیجئے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا، کہ یُوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ اَدا کہ یُوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یُوں

"غیر سے رات کیا بنی!" یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یُوں

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مُدّعا کہ یُوں

مَیں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وَضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یُوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یُوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یُوں

۱۲۷

اسد، بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے، تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عُریاں ہیں

۱۲۸

فتادگی میں قدم اُستوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ، سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
طلسمِ مستی دل آں سوے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے، غالب
بسانِ دشت، دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

۱۲۹

دل کو اظہارِ سخن، اندازِ فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

۱۳۰

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وَا ہو
بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ مَعاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

۱۳۱

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

۱۳۲

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں" ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں!
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خُو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

۱۳۳

قفس میں ہُوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں!
نہیں دیکھا شناور جُوئے خوں میں تیرے توسن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مَرے بُت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یُوں بے خبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

۱۳۴

ستم کش کا کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اس سے رَبط کروں جو بہت ستمگر ہو

۱۳۵

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانو

ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو!
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

۱۳۶

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو

رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی سِتم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

۱۳۷

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مَرتا ہوں مَیں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھُٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب! اور مرا بادشاہ ہو

۱۳۸

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خُو تو کیوں کر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیوں کر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو"

۱۳۹

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پُوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
یہ کہہ سکتے ہو، "ہم دل میں نہیں ہیں" پَر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جُرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی؟"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

۱۴۰

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۱۴۱

حُسن بے پروا گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کمیں گاہِ نظر میں، دل تماشائی نہ ہو

بزمِ کثرت عالمِ وحدت ہے جینے کے لیئے
بے نیازِ عشق، اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو

۱۴۲

وضعِ نیرنگیِ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

تختۂ گور، سفینے کے مماثل ہیں اسدؔ
بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنارا ہم کو

از مہر تا بہ ذرّہ، دِل و دِل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

۱۴۴

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشوارئ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

ہندوستان سایۂ گُل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بُتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں
دردِ جُدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

۱۴۵

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالب
چاہیئے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

۱۴۶

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت و بیاں
ہے سخن گرد ز داماںِ ضمیر افشاندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں وَرَقِ ناخواندہ
حیف بے حاصلیِ اہلِ ریا پر غالبؔ
یعنی ہیں ماندہ ازاں سو، وازیں سو راندہ

۱۴۷

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب! دِل نہ سمجھ، بَلا سمجھ
گاہ بخُلد امیدوار، گہ بجحیم بیمناک
گرچہ خُدا کی یاد ہے، کُلفتِ ماسوا سمجھ
اے بلبِ حُسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو مُنفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ
نے سرو برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خَلق، تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہُوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

تیرے کُوچہ کا ہے مائل دلِ مُضطر میرا
کعبہ اِک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خُلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سَیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھَوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اِک اَور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ق

سَر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رُو سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے‘ جو بات چاہیئے

۱۲۹

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف‘ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ‘ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم؟
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اتنا بُرِّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ!
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۵۰

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیماں و جامِ جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۵۱

ہے بزمِ بُتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
رندانِ درِ مے کدہ، گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

کیا پوچھے ہے بر خودغلطی ہائے عزیزاں
خواری کو بھی اِک عار ہے عالی نسبوں سے

۱۵۲

رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیوں کر
ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب نبھائی اُس نے
نہ سہی ہم سے پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

۱۵۳

غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک   آنسو کی بُوند گوہرِ نایاب ہو گئی

۱۵۴

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں، شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

۱۵۵

تو، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم ان کو
وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

۱۵۶

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

۱۵۷

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت، دل میں سوزِ غم چھپانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے، جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

۱۵۸

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

۱۵۹

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو　　تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

۱۶۰

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا!
بس چُپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

۱۶۱

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دِل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مِری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عُمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عُمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گُل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رُسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرُومِ جمال
ایک دِل تِس پر یہ نااُمیدواری ہائے ہائے

عِشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دِل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

۱۶۲

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو
اِتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے؟

۱۶۳

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ اِنفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے اسد
دل وقفِ درد رکھ کہ فقیروں کا مال ہے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے ۱۶۴ غافلاں! آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

نظر بنقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعویٔ چمن نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

۱۶۹

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

ہر چند عمر گزری آزردگی میں لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی
ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

۱۶۷

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

۱۶۸

خزاں کیا؟ فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پَر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

۱۶۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عُمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۷۰

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے
کرتا ہے بس کہ باغ میں تُو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

۱۷۱

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱۷۲

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہُوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے!

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم!
تُو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

۱۷۳

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اِس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱۷۴

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے؟
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

دُور چشمِ بد! تری بزمِ طرب سے واہ وا!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھُلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۱۷۵

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

۱۷۶

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

۱۶۷

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۶۸

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے، وَاماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر، کہ کس مشکل میں ہے

۱۶۹

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہوگیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کُوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

ہر بُوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

۱۸۰

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

۱۸۱

نشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم ٭ صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

۱۸۲

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۸۳

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن مُعیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہُوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مَرتے ہیں آرزُو میں مَرنے کی
مَوت آتی ہے پَر نہیں آتی

کعبہ کِس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ؟
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے ؟
آخر اِس دَرد کی دَوا کیا ہے ؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار !
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟
مَیں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مُدّعا کیا ہے ؟
جب کہ تجھ بِن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے ؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و اَدا کیا ہے ؛
شکنِ زُلفِ عنبریں کیوں ہے ؛
نِگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے ؛
سَبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں ؛
اَبر کیا چیز ہے ' ہَوا کیا ہے ؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمّید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں
مَیں نہیں جانتا دُعا کیا ہے؟
مَیں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

۱۸۵

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے
اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وُہ آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے
جلّاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ مِلتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اِس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
اِس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۱۸۶

پھر کچھ اِک دل کو بے قراری ہے
سینہ جُویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن!
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مَرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کُھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۸۷

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

۱۸۸

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دَہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے سِتم ہوئے
لکھتے رہے جُنوں کی حکایاتِ خُوں چکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے عَلَم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی!
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱۸۹

یُونہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خُوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عَدو کو یارب! مِلے میری زندگانی

۱۹۰

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یُوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خُوباں میں دیکھنا
کیا اَوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمھیں ہوسِ ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں،
نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱۹۲

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

۱۹۳

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ میں جانوں اور نہ تُو جانے
نفَس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تُو جانے

۱۹۴

تا چند نازِ مسجد و بُت خانہ کھینچیے
جُوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

۱۹۵

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہیے تو گلا ہوتا ہے"

پُر ہوں مَیں شکوے سے یُوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پَرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

مَیں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالبؔ مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۱۹۶

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تُو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگُو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے ؛

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدُو کیا ہے ؛

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے ؛

جلا ہے جسم جہاں، دِل بھی جل گیا ہوگا
کُریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے ؛

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے ؛

وہ چیز جس کے لیئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مُشکبُو کیا ہے ؛

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے ؛

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزُو کیا ہے ؛

ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرُو کیا ہے ؛

۱۹۷

مَیں، انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے! تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی، یارب، کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

۱۹۸

آ کہ، مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بے دادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے
تُو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۹۹

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

۲۰۰

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تُو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

۲۰۱

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھئے پاتے ہیں عشاق بُتوں سے کیا فیض!
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن!
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۲۰۲

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یُوں تشنہ لب پیغام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مَے اور صبح دَم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہُوں مَیں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

پھر اِس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطّۂ خاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے　　یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

۲۰۴

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ہوا آئینہ، جام بادہ عکسِ روئے گلگوں سے
نشانِ خالِ رُخ، داغِ شرابِ پرتگالی ہے
اسد اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

۲۰۵

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر، آشفتہ بیانی میری
متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا، دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت اَرزاں ہے گرانی میری

۲۰۶

کیا ہے ترکِ دُنیا کاہلی سے
ہمیں حاصِل نہیں بے حاصلی سے
خدا یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم دَر بَدر ناقابلی سے

۲۰۷

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے
بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ، تو پھر
کیوں نہ دِلّی میں ہر اِک ناچیز نوّابی کرے

دِلّی کے رہنے والو اسدؔ کو ستاؤ مت بیچارہ چند روز کا یاں میہمان ہے

۲۰۸

گلشن کو تری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے

از بس کہ سکھاتا ہے غمِ ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا، اک چشم نمائی ہے

۲۰۹

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب! اسے قسمت میں عدو کی

۲۱۰

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

۲۱۱

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیے

۲۱۲

جادو ہے یار کی روشِ گفتگو اسدؔ یاں جز فسوں نہیں، اگر افسانہ چاہیے

۲۱۳

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل ؛
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایّامِ گل
کچھ اِدھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۲۱۴

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
نگہِ گرم سے اِک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

۲۱۵

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اِس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۲۱۶

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دِل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگاہ کو آب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

۲۱۷

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۲۱۸

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے"، نہیں ہے
شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"

۲۱۹

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۲۲۰

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے
درپردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

اسد ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا ۲۲۱ مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

۲۲۳

دیا ہے دل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہیے
ہُوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

رہے ہے یُوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یُوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پُرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے

انھیں سوال پہ زعمِ جنُوں ہے کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کِس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اِس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ!
پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

۲۲۵

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں؟
آرزُو سے ہے شکستِ آرزُو مطلب مجھے

دِل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

۲۲۶

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے ہے دل میں تیر اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

۲۲۸

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر وہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مجھ سے
ہُوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مُدّعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲۲۸

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگِ سُلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جُز نام نہیں صُورتِ عالم مجھے منظُور
جُز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

گو ہاتھ کو جُنبش نہیں، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مِرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو؟ اچھّا مِرے آگے

۲۲۹

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدّعا کہیے"
تمہیں کہو کہ جو تم یُوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم "ستمگر ہیں"!
مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی، پر دِل میں جب اُتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دِل کُشا کہیے

جو مُدّعی بنے، اُس کے نہ مُدّعی بنیے
جو ناسزا کہے، اُس کو نہ ناسزا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خُوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

۲۳۰

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گِلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۲۲۱

ہم نشیں مت کہہ اکہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۲۲۲

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بہ سر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پُرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گُل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تُو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

سَر بَر ہُوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ دَرد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

حُسنِ فروغِ شمعِ سُخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

۲۲۳

ابنِ مَریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دَوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مَدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو، گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے؟
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقّع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی!

۲۳۴

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے
بہت نکلے مرے اَرمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرُو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کُھل جائے ظالم تیرے قامت کی دَرازی کا
اگر اِس طُرّۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خَم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اِس دَور میں منسُوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جَم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی دَاد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق مَرنے اور جِینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دَم نکلے

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں وَاعظ
پَر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۲۳۶

صد جلوہ رُو برو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب، نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

۲۳۷

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

۲۳۸

چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بُر ہوس ہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے

یک نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے اُن کو جو کہویں "زندگانی مفت ہے"

۲۳۹

چھیڑے ہے شبنم آئینۂ برگِ گُل پر آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے
پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

۲۴۰

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۲۴۱

قُمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو!
معشوقی و بے حوصلگی طُرفہ بلا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب! اِدھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گُناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گُناہوں کی سزا ہے
بیگانگیٔ خلق سے بے دِل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خُدا ہے

۲۴۲

دل تو ہو اچھا نہیں ہے گر دماغ — کچھ تو اسبابِ تمنّا چاہیے

۲۴۳

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نُور کی
قِسمت کھُلی ترے قد و رُخ سے ظہُور کی

اِک خُونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہُور کی

آمد بہار کی ہے جو بُلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیُور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حَج کا ثواب نذر کروں گا حُضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ

ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نَے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی

پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟

پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے اِبرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۲۴۵

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازئ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دِل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیئے ہوئے

دَوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دِلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کیئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیئے ہوئے

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دِن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیئے ہوئے

نویدِ امن ہے بے دادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم مَیں نے پاسباں کے لیے

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

زمانہ، عہد میں اس کے، ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیئے
ورق تمام ہُوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لیئے
اَدائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیئے

۲۴۷

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تالبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اُٹھتے ہیں
لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
سامنا حُور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
اب ہے دِلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نوّاب سے بھی مل آئے

۲۴۸

گدائے طاقتِ تحریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے
اسدؔ طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

۲۴۹

لطفِ عشقِ ہر یک، اندازِ دگر دکھلائے گا
بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے

۲۵۰

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

۲۵۱

جس طرف سے آئے ہیں، آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم بیہودہ ہے

اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مُو حالِ دل پرسیدنی جانے

۲۵۳

اسد وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں با دلِ آزادہ آتا ہے

۲۵۴

اسد جمعیتِ دل در کنارِ بیخودی خوشتر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

۲۵۵

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

روز اس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا؟ ٭ دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے

عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

اسدؔ، بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

قطعات

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے، ہمنشیں
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب!
وہ نازنیں بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر!
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ!
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

○

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے؟"

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

○

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید!
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں، گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے، بنِ ناخنِ تدبیر میں، کیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!

○

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سَو پشت سے، ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ، شاعری، ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں، اور مرا مسلک ہے صُلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے، پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

مَیں کون اور ریختہ، ہاں، اس سے مدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا، ز رہِ امتثالِ اَمر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُوسیاہ!
سودا نہیں، جُنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں، غالب! خدا گواہ!
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

○

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اِک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اِک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیٔ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز — رُوشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ، از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اِتنا خوار

کہ گر اپنے کو مَیں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر! — نسبتیں، ہو گئیں مشخّص، چار

نہ کہوں آپ سے، تو کس سے کہوں؟ — مدّعائے ضروریُ الاظہار

پیر و مُرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے، آخر — تا نہ دے، بادِ زمہریر، آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ — جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!

آگ تاپے کہاں تلک انساں! — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار!

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی — وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار!

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے مِلنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھٹا ہی ہو سال میں دو بار!

بسکہ لیتا ہوں، ہر مہینے، قرض — اور رہتی ہے سُود کی تکرار

میری تنخواہ میں چہارم کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سُنیے — ہے، زباں میری، تیغِ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار

ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا! — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار!

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو، مجھ کو، زندگی دُشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سَروکار

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

○

نُصرتُ المُلک بہادر، مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے، تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر، تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِدست
نسبت اِک گونہ، مرے دل کو، ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے، توسنِ دولت کی عناں!
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر نہ ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو، شرف خضر کی بھی مجھ کو، ملاقات سے ہے
اس پہ گزرے نہ گماں رِیو و رِیا کا زنہار!
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو
رکھ دیں چمن میں، بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیئے، اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

اِفطارِ صوم کی کچھ، اگر، دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے؟

○

رسیہ گلیم ہوں، لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے،
کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

○

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں

○

خامے کا صفحے پر رَواں ہونا
شاخِ گُل کا ہے گُلفشاں ہونا
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے

آم کا، کون، مردِ میداں ہے؟ ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ آئے، یہ گوے اور یہ میداں!

آم کے آگے پیش جاوے خاک پھوڑتا ہے جلے پھپھولے، تاک

نہ چلا، جب کسی طرح، مقدور بادۂ ناب بن گیا، انگور

یہ بھی، ناچار، جی کا کھونا ہے شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے؟ آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟

نہ گُل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار

اور دوڑایئے قیاس کہاں؟ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

جان میں ہوتی، گر، یہ شیرینی کوہکن، باوجودِ غمگینی،

جان دینے میں اُس کو یکتا جان پر وہ یُوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یُوں مجھے یہ ثمر کہ دواخانۂ ازل میں، مگر

آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے، بحکمِ ربّ الناس بھر کے بھیجے ہیں، سر بمُہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر نشاں، یہ نخل ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل!

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس!

آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طلائی دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دُودمانِ آب و ہوا

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
نازپروردۂ بہار ہے آم

○

بسکہ فعّالِ مایُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

مَیں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟
وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یُوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب؟

بال و پَر دو چار دِکھلا کر، کہا صیّاد نے:
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب!"

○

مسلمانوں کے میلوں کا ہُوا قتل
نشاں باقی نہیں اب سلطنت کا

پُجے ہے جوگ مایہ اور دیبی
مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

○

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبّت کا ہے وُفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہُوا ہے اِسی مُلک سے ظہُور
ہے اصلِ تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دُور دُور

○

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم
کہ دِلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں

سو ناج کے، جو ہے مقلوبِ جناں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہُوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ "کل کیا پکائیں"؟
وہ کھٹے، کہاں پائیں، اِلی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؛
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو، اس کو، کیا، کھا کے ہم حظ اُٹھائیں؛

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرم
رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دُور ہے، اِس مُلک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں، تو کم
رامپور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

رامپور ایک بڑا باغ ہے' از روئے مثال'
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں' دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مُدام
دُرِ شہوار ہیں' جو گرتے ہیں قطرے پیہم
ہم نہ تبلیغ کے مائل' نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا' غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا' عالم
اوّلاً' عمرِ طبیعی بدوامِ اقبال
ثانیاً' دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

قصائد

دہر' جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے' اگر حسن نہ ہوتا خود بیں؟

بے دلی ہائے تماشا، کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا، کہ نہ دُنیا ہے، نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں

عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رُخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بیستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا، اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ "لاحول" لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر! "یا علی" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں!

ہاں، مہِ نو، سنیں ہم اُس کا نام / جس کو تُو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح / یہی انداز اور یہی اندام

بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟ / بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام

اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا / آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

عذر میں، تین دن نہ آنے کے / لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا / صبح جو جاوے اور آوے شام

ایک مَیں کیا کہ سب نے جان لیا / تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ / مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام؟

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں / ایک ہی ہے اُمیدگاہِ انام!

مَیں نے مانا کہ تُو ہے حلقہ بگوش / غالب اُس کا، مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو / پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟ / مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے / اَور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص / گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا، اِک بلوریں جام

پھر غزل کی روِش پہ چل نِکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟

مے ہی پھر کیوں نہ مَیں پیے جاؤں؟
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام

کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دَیر میں اِحرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں، ورنہ، غالب اپنا نام؟

تُو نہیں جانتا، تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بُلند مقام

قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ
مَظہرِ ذُوالجلالِ وَالاِکرام

جب اَزل میں رقم پذیر ہوئے
صَفحہ ہائے لَیالی و اَیّام

اور اُن اَوراق میں، بکلکِ قضا
مُجملاً مُندرِج ہوئے احکام

لِکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کُش"
لِکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"

آسماں کو، کہا گیا کہ کہیں:
"گنبدِ تیز گرد نیلی فام"

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں:
خال کو "دانہ" اور زُلف کو "دام"

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وَضعِ سوز و نَم و رَم و آرام

مہرِ رَخشاں کا نام "خسروِ روز"
ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"

تیرے توقیعِ سلطنت کو بھی   دی، بدستور، صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم،   اُس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو اَبد تک رسائیِ انجام!

○

صُبحدم، دروازۂ خاور کھُلا   مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے، آیا، صَرف میں   شب کو تھا، گنجینۂ گوہر، کھُلا
وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود   صُبح کو، رازِ مہ و اختر کھُلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا، یہ بازیگر، کھُلا
سطحِ گردُوں پر پڑا تھا، رات کو   موتیوں کا، ہر طرف، زیور کھُلا
صُبح آیا، جانبِ مشرق، نظر   اِک نگارِ آتشیں رُخ سَر کھُلا
تھی نظر بندی، کیا جب رَدِّ سحر   بادۂ گُلرنگ کا ساغر کھُلا
لا کے، ساقی نے، صبوحی کے لیئے   رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ   کعبۂ امن و اماں کا دَر کھُلا
تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا   خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھُلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے   رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھُلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں   مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھُلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عُقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا

پہلے دارا کا، نکل آیا ہے، نام — اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا

رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر، کھُلا

تھا دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید — کس نے کھولا؟ کب کھُلا؟ کیونکر کھُلا؟

باغِ معنی کی، دکھاؤں گا بہار — مجھ سے، گر، شاہِ سخن گستر کھُلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی، نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

کُنج میں بیٹھا رہوں، یُوں پَر کھُلا — کاشکے ہوتا قفس کا دَر کھُلا

ہم پکاریں اور کھُلے، یوں کون جائے؟ — یار کا دروازہ پاویں، گر، کھُلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا، ہے، راز دشمن پر کھُلا

واقعی، دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھُلا

مِنّت کا، کس کو بُرا ہے بدرقہ — رہروی میں، پردۂ رہبر کھُلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کھُلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ — رہ گیا، خط میری چھاتی پَر کھُلا

دیکھیو، غالب سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

پھر، ہُوا مدحت طرازی کا خیال — پھر، مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

خامے سے پائی، طبیعت نے مدد — بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر کھُلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ | یاں عَرَض سے رتبۂ جوہر کھُلا
مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا | بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب | اب عُلُوِّ پایۂ منبر کھُلا
سکّۂ شہ کا ہُوا ہے رُوشناس | اب عیارِ آبروئے زر کھُلا
شاہ کے آگے دَھرا ہے آئنہ | اب مآلِ سَعیِ اسکندر کھُلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے | اب فریبِ طُغرل و سنجر کھُلا
ہو سکے کیا مدح؛ ہاں، اِک نام ہے | دفترِ مدحِ جہاں دَاوَر کھُلا
فکر اچھی، پر ستایش ناتمام | عجزِ اعجازِ ستائش گر کھُلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل | تم پہ، اے خاقانِ نام آور کھُلا
تم کرو صاحب قرانی، جب تلک | ہے طلسمِ روز و شب کا دَر کھُلا

○

رگنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ
دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پُوچھا تھا
کہ "دیکھ کتنی، اُٹھا لائے گا یہ تار گرہ؟"
کہا کہ "چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے، تو پاویں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں ہے مہاراؤ راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں، اس تار پر نثار گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیئے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نو بہار گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیئے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں، گہر ہائے شاہوار گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیئے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں، ثمر ہائے شاخسار گرہ

o

مرحبا! سالِ فرخی آئیں | عیدِ شوال و ماہِ فرودیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز | لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو، اس اکیس دن میں ہولی کی | جا بجا، مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں، کو بکو، عبیر و گلال | باغ میں، سو بسو گل و نسریں
شہر، گویا، نمونۂ گلزار | باغ، گویا، نگار خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب | جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں　　منعقد، محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب　　رونق افزائے مسندِ تمکیں

○

کرتا ہے، چرخ، روز بصد گونہ احترام
فرماں روائے کشورِ پنجاب کو، سلام
حق گوی و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک، جس سے ہوا، بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو، جگر
کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغ کا نیام
وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آ گئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ ایک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام

عزت پہ، اہلِ نام کی ہستی کی، ہے بنا
عزت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اُس ناز کا، فلک نے لیا مجھ سے، انتقام

امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال
بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے، قیام

ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِّ شعر یہی ہے، قدیم سے
یعنی، دعا پہ مدح کا، کرتے ہیں، اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اِقلیمِ ہندوستان سے تا ملکِ روم و شام!

سہرا

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سَر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سَر پر، سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور، سہرا

سَر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کُلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا

ناؤ بھر کر ہی، پروئے گئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو، گرمی سے، پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر، سہرا

یہ بھی اِک بے اَدبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز،
چاہیے، پھولوں کا بھی ایک مُقرر، سہرا

جب کہ اپنے میں سما دیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا، بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا؟

رُخِ روشن کی دَمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ کھلا دے فروغِ مہ و اختر، سہرا؟

تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانبارئِ گوہر سہرا؟

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اِس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

رُباعیات

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
"گویم مشکل، وگر نگویم مشکل"

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا، سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ، لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

انتخاب
کلامِ فانی

قطعات

مسنج شوکتِ عرفی که بود شیرازی　　مشو اسیر زلالی که بود خوانساری
بسومناتِ خیالم درآئی تا بینی　　روان فروز بر و دوشهای زنّاری

(اقتباس از قصیده دوم در نعت)

قطعهٔ

نه چنانم که بر عقیدهٔ خویش　　از فسونِ کسے ہراس کنم
نه توانم که از نصیحت و وعظ　　عالمی را خداشناس کنم
نه که اخبار پاستانی را　　دیو افسانها قیاس کنم
نه که ز آثار هرچه مشهورست　　اثری تازه اقتباس کنم
نه که زبهر حلّه‌هائے بہشت　　ترکِ آرایشِ لباس کنم
نه که در عالم فراخ روی　　عار از ژندهٔ پلاس کنم
چون نه من ساقیم نه محتسبم　　نه بریزم نه مے بکاس کنم
نه بواجب ز سعی درمانم　　نه بہر مدعا مکاس کنم
بر مدارا اگر مدار نہم　　کاخِ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید ز من که در گفتار　　مدحتِ لاله سورداس کنم
فعلی از مدح خود توانم خواند　　گرنه لب را ز لاف پاس کنم
خوشنوایم مرا رسد که ز رشک　　زہر در جامِ بونواس کنم

میتوان پنجہ از لطافتے بُرد | پارۂ جمع گر حواس کنم
توسنِ طبع مَن بدان آرزد | کہ ز بالِ پری قطاس کنم
مزرعِ خویش رایگاہ دِرَوْ | ناخنِ حور صرفِ داس کنم
ہمچو سرو از غم خزان برہد | گلبنے را کہ من مساس کنم
کوثر از موج واکند آغوش | اگر اندازِ ارتماس کنم
چہ ازین فرقۂ ادانشناس | خویشتن را ہلاک یاس کنم
بد و نیکی ز گفت ہای حسزین | صفحہ را طُرّۂ ایاس کنم
"لائق مدح در زمانہ چو نیست | خویشتن را ہمی سپاس کنم
کس زبانِ مرا نمے فہمد | بعزیزان چہ التماس کنم"

قطعہ

غالب از خاک پاک تورانیم | لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے | بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعت اتراک | در تمامے ز ماہ دہ چندیم
فن آبائی ما کشاورزیست | مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور ز معنی سخن گزاردہ | خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم | عقلِ کل را بہین فرزندیم
ہم بتابش برق ہم نفسیم | ہم بہ بخشش بابر مانندیم

بتلاشی که ہست فیروزیم بمعاشی که نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم دانی که اصل گوہرم از دُودۂ جم ست
میراث جم که مے بود اینک بمن سپار زین پس رسد بہشت که میراثِ آدم ست

قطعہ

دل اگر خاست باید افشردن غم زہد دیر بریزش نسبت دو، دورازی بوده است
اینکه افشاندم و ہم گیر ز مشقی بیش نیست وینکه خود خون گردد و ریزد گدازی بوُده ست

قطعہ ۵

ہزار معنیِ سرجوش خاص نطقِ من ست کز اہلِ ذوق دل و گوئی از عسل بُردست
ز رفتگان بیکے گر توارد م رو داد مدن که خوبیِ آرائش غزل بُردست
مراست ننگ ولی فخر اوست کان بسخن بسعیِ فکرِ رسا جا بدان محل بُردست
مبر گمانِ توارُد یقین شناس که دُزد متاعِ من ز نہان خانۂ ازل بُردست

قطعہ ۶

غالب درین زمانہ بہر کس که وا رسی مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اُوست
زین مایہ زلّہ که بنالد بخویشتن ہر گنج شایگان که بود رایگان اُوست
کس را ز دست برد خیالش نجات نیست گر پیش از گذشته و گر در زمان اُوست

جز من کسی بدزد سخن وا نمی رسد　　گو خوش بخوان که انجمنی مدح خوان اوست
آری ز چک بود نه تمسک ز هر که هست　　نی دستخط نه مهر نه نام و نشان اوست
مضمون شعر نوٹ بود فی زماننا　　یعنی بدست هر که بیفتاد آن اوست

قطعهٔ ۷

ای که در بزم شهنشاه سخن رس گفتهٔ　　کی بپر گوئی فلان در شعر همسنگ منست
راست گفتی لیک میدانی که نبود جای طعن　　کمتر از بانگ دهل گر نغمهٔ چنگ منست
نیست نقصان یکدو جزو است ار سواد ریخته　　کان دو زم برگی ز نخلستان فرهنگ منست
فارسی بین تا به بینی نقشهای رنگ رنگ　　بگذر از مجموعهٔ اردو که بیرنگ منست
کی درخشد جوهر آئینه تا باقیست زنگ　　صیقلی آئینه ام این جوهر آن زنگ منست
دشمنی را همنفس شرط است دانی کو نیست　　از تو نبود نغمه در سازی که در چنگ منست
راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید　　هرچه در گفتار فخر تست آن ننگ منست

قطعهٔ ۸

فرصت اگرت دست دهد مغتنم انگار　　ساقی و نغنی و شرابی و سرودی
زنهار از آن قوم نباشی که فریبند　　حق را بسجودی و نبی را بدرودی

قطعهٔ ۱۰

ساقی بزم آگهی روزی　　راوقی ریخت در پیالهٔ من
چون دماغم رسید زان صهبا　　شدم از ترکتاز وهم ایمن

گفتم ای "محرم سرائے سرور" — از ادب دور نیست پرسیدن

اول از دعوئے وجود بگو — گفت کفرست در طریقت من

گفتم آخر نمود اشیا چیست — گفت ہی ہی نمیتواں گفتن

گفتمش با لحن الفان چہ کنم — گفت طرح بت ئے صلح فگن

گفتم ایں حب جاہ و منصب چیست — گفت دام فریب اہرمن

گفتمش چیست منشاءِ سفرم — گفت جور و جفائے اہل وطن

گفتم اکنون بگو کہ دہلی چیست — گفت جانست و ایں جہانش تن

گفتمش چیست ایں بنارس گفت — شاہدی مست محو گل چیدن

گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت رنگیں تر از فضائی چمن

گفتمش سلسبیل خوش باشد — گفت خوشتر نباشد از سوہن

حال کلکتہ باز جستم گفت — باید اقلیم ہشتمش گفتن

گفتم آدم بہم رسد در وے — گفت از ہر دیار و از ہر فن

گفتم اینجا چہ شغل سود دہد — گفت از ہر کہ ہست ترسیدن

گفتم اینجا چہ کار باید کرد — گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم ایں ماہ پیکران چہ کس اند — گفت خوبان کشور لندن

گفتم ایشان مگر دلے دارند — گفت دارند لیکن از آہن

گفتم از بہر داد آمدہ ام — گفت بگریز و سر بسنگ مزن

گفتم اکنون مرا چہ زیبد گفت | آستیں بر دو عالم افشاندن
گفتمش باز گو طریق نجات | گفت غالب بجز بلا رفتن

قطعہ ۱۲

ای کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم | مخلص صادق الولائی تو من
گر ترا شیوہ شاہدے بودے | کردمی جان و دل فدائی تو من
ور ترا پیشہ شاعرے بودے | سودمی چشم و سر بپائی تو من
ور ترا پایہ خسروے بودے | سفتمے گوہر ثنائی تو من
چون از ینہا نہ مرا چہ ضرور | کہ شوم ہرزہ مبتلائی تو من
بسکہ بر مال و جاہ مغرورے | نیستم خوش ازیں ادائی تو من
بتو ہرگز ندادمے زر و سیم | خواجہ گر بودمے خدائی تو من

قطعہ ۱۸

چون الف بیگ در کہن سالے | پسری یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے | الف مفتخے بود ہمزہ

قطعہ ۲۰

آن پسندیدہ خوی عارف نام | کز رخش شمع دودمان منست
آنکہ در بزم قرب و خلوت انس | غمگسار مزاج دان منست
زور بازوی کامرانی من | راحت روح ناتوان منست

ای کہ میراث خوار من باشے — اندر اُردو کہ آں زبان منست

از معانے زمبدءِ فیاض — باد آن تو ہر چہ آن منست

قطعہ ۳

دیدی آن بدگہر دمہر وولایش بہ یزید — کہ بخشم آید اگر زشت وپلیدش گویند

زان کہ او خود بسرِ ابنِ علی تیغ نزاند — خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند

گفتم البتہ کہ شبیر بدان می آرزد — کہ شہیدش بنویسند وسعیدش گویند

گفت زان روکہ عزیزان ہمہ مُسلم بودند — نتوان کرد گوارا کہ شہیدش گویند

قطعہ ۴

ہفت گنجینۂ پرویز نہ سنجم بدو جو — تشنۂ بادۂ نابم نہ گدا پیشۂ مال

چُون عطای تو بود پاک ذتحریم چہ باک — مَی حرامست ولی میخورم از وجہِ حلال

انچہ میخواہم ازین توطیہ دانے چہ بُوَد — کُنجی از باغ وخُمی از مَی وجامی ز سفال

بستہ بر غیر دربکلبہ در نظم طراز — رُفتہ از زاویہ خاشاک وز دل گردِ ملال

گہ دران گوشہ زخود رفتہ وگاہی ہشیار — گہ در اندیشہ غزل سنج وگہی مدح سگال

گہ ز اسرار ازل یافتہ در سینہ نشان — گہ ز آثار خرد ریختہ بر صفحہ لآل

چون شود شام نہم شمع فروزندہ بہ پیش — از درخشندگیِ جوہرِ عقلِ فعّال

دارم اُمید کہ غالب اگرش عُمر بود

ہم بدین سان گزراند شب وروز ومہ وسال

قطعہ ۴۴

بہ آدم زن بشیطان طوق لعنت | سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم | گران تر آمد از طوقِ عزازیل

از مجموعۂ سبد چین

نوروز و مہرگاں نبوَد در طریق ما | اما شگفتہ روئی گلہائے تر خوش است
نوروز عید نیست بہار است و در بہار | آئینِ شادمانی و ذوقِ نظر خوش است
از یادِ مہر یر بہ گیتی نشاں نماند | جوشِ گل و نشاطِ نسیم سحر خوش است
دریا خوش و شراب خوش و کوہسار خوش | منزل خوش است توشہ خوش است و سفر خوش است
اینہا خوش است و مہر تو آوردہ روزگار | ہم مہر تست ہر چہ ازیں بیشتر خوش است

قطعہ ۱۰

جان عزیز است و اہل عزت را | عزت از جاں عزیز تر باشد
خود بفرما چساں تواند زیست | ہر کرا ہر دو در خطر باشد

قطعہ ۱۱

گیرکہ در روز حشر چوں تو بگفتی | بر سر دوزخ نہند تیرہ نہنبن
واں کہ نباشد دراں مضیق مصیبت | در طلب نان و جامہ کشمکش از زن

وان کہ نباشد دراں مقامِ صعوبت | شورِ تقاضائے نار وائے مہاجن

قطعہ ۲۷

گفتم بخرد بخلوتِ اُنس | کائے شمع و چراغِ ہفت ایواں
آیا ز چہ رُو بود کہ نواب | ننوشت جوابِ نامہ ام ہاں
عقلم بجواب گفت غالب | زنہار مخور فریبِ شیطاں
نواب بفکرِ ارمغانست | تا نامہ فرستدت بساماں
زود است کہ جمع نیز گردد | دیر است کہ دادہ است فرماں
تا راہ روانِ بحر و بر گرد | آرند بکوششِ فراواں
دیبا ز دمشق و مخمل از روم | الماس ز معدن و زر از کاں
فیل از دکن و زمرد از کوہ | توسن ز عراق و دُر ز عماں
فیروزۂ نغز از نشاپور | یاقوتِ گزیدہ از بدخشاں
جمازہ تیز رو ز بغداد | شمشیر برندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر | زر لفتِ گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں روست | بر رنج و ملال نیست برہاں
گفتم کہ چوں بامن ایں کرم کرد | آں قبلہ و قبلہ گاہِ اعیاں
من نیز طلب کنم بر ایشں | ایں خواہش، گرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر | انگشتر و تخت از سلیماں

از عالمِ غیب جامِ جمشید | از چشمۂ خضر آبِ حیواں
عمرِ ابد و نشاطِ جاوید | نیروئے دل و ثباتِ ایماں
توفیقِ جوابِ نامۂ خویش | توقیعِ عطا و بذلِ احساں

قطعہ ۲۶

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ | درخصوصِ گفتگوئے پارسی انشا کردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد بلے | ننگ دارد حلم از کارے کہ آغا کردہ است
انتقام جامعِ "برہانِ قاطع" می کشد | آنچہ ما کردیم با دے خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت | ولے بروے گر بتقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک داد بذلہ سنجی دادہ ام | شوخیِ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است

قطعہ ۱۹ در مدحِ گربۂ خود (از کلیات)

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے | کز بالِ پری زاد بود موجِ رمِ او
چوں صورتِ آئینہ زاز اطلطفت | آید بنظر بچۂ او از شکمِ او
جوشِ گل و بالیدگیِ موبہ زنگست | دُم لا بہ کناں آمدنِ دمبدمِ او
در عربدہ چوں بند زدُم باز کشاید | لرزد شکنِ طرۂ خوباں ز خمِ او
تا مہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر | بادا کفِ دستِ من و پشت و شکمِ او

ترکیب بند

تصنیف ۱۸۵۰ء که در کلیات نظم فارسی شریک نبوده

خواهم از بند بزندان سخن آغاز کنم — غم دل پرده دری کرد فغان ساز کنم
در خرابی بجهان میکده بنیاد نهم — در اسیری به سخن دعویٔ اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید بشعر آویزم — روزکے چند رسن تابیٔ آواز کنم
چه دزدان گرفتار وفا نیست بشهر — خویشتن را بشما همدم و همراز کنم

گرچه توقیع گرفتاریٔ جاویدم نیست
لیکن از دهر دگر خوشدلی امیدم نیست

شمع هر چند بهر زاویه آسان سوزد — خوشتر آنست که بر نطع در ایوان سوزد
عودِ من هرزه مسوزید دگر سوختنی ست — بگذارید که در مجمرِ سلطان سوزد
آه ازین خانه که روشن نشود در شب تار — جز بدان خواب که در چشم نگهبان سوزد
آه ازین خانه که در روے نتوان یافت هوا — جز بسموم که خس و خارِ بیابان سوزد

اے که در زاویه شبها بچراغم شمری
دلم از سینه برون آر که داغم شمری

پاسبانان بهم آئید که من می آیم — در زندان بگشائید که من می آیم
جاده نشناسم و زنبوهِ شما می ترسم — راهم از دور نمائید که من می آیم

ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید — بخت خود را بستائید کہ من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است — بہرہ از من بربائید کہ من می آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیِ من
غیر نشگفت خورد گر غمِ ناکامیِ من

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی — آفتاب از جہتِ قبلہ بر آمد گوئی
ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع — خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی
خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غمخواریِ من — رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفے خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

خواجہ دانم کہ لبسی روز نہانم در بند — لیک دانی کہ شب از روز ندانم در بند
شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم — از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند
یارب ایں گوہرِ معنی کہ فشانم ز کجاست — بند بر دل بود و نیست زبانم در بند
خوے خوش بہرِ مصیبت زدہ گنجے دگر است — رنجہ از دیدنِ رنجِ دگرانم در بند

نیستم طفل کہ در بند رہائی باشم
ہم ز ذوق ست کہ در سلسلہ خائی باشم

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود — چکنم چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبود

زیں دو سرہنگ کہ پیوستہ بہم می ترسم — بیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود
ہمدماں دارم امید رہائی دربند — دامن از بعد رہائی تہ سنگم نبود
جور اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن — طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

بہ صریر قلم خویش بود مستی من
اندریں بند گراں بیں و سبکدستی من

ہمدماں در دلم از دیدہ نہانید ہمہ — غالب غمزدہ را روح و روانید ہمہ
درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بودست — من بہ بینم کہ بر آئینہ بر آئید ہمہ
روزے از مہر بگفتید فلانے چوں است — بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
چارۂ گر نتواں کرد دعائے کافیست — دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ

من نباشم کہ بہر بزم ز من یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

متفرق از ترکیب بند در منقبت

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام — شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام
محرم راز نہان روزگارم کردہ اند — تا بجز فہم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند
پایۂ من جز بچشم من نیاید در نظر — از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر
تیغ فروشم در تموز و کلبہ دور از چارسوست — می رود سرمایہ از کف تا خریداری رسد
عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام — ہوشیارم بخداؤ یا علی دیوانہ ام

مثنوی چراغ دَیر (۳)

نفس با صور دمسازست امروز	خموشی محشر رازست امروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم	کفِ خاکم غبارے می نویسم
پریشان تر ز زلفم داستانیست	بدعوی ہر سرِ مُویم زبانیست
شکایت گونہ دارم ز احباب	کتانِ خویش میشویم بمہتاب
نفس ابریشم سازِ فغانست	بسانِ نَے تنم در استخوانست
ز دہلی تا برون آوردہ بختم	بطوفانِ تغافل دادہ رختم
کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست	مرا در دہر پنداری وطن نیست
مگو داغِ فراقِ بوستان سوخت	غمِ بیمہری این دوستان نیست
جہان آباد گر نبود اَلَم نیست	جہان آباد بادا جائے کم نیست
نباشد قحط بہر آشیانے	سرِ شاخِ گلے در گلستانے
بخاطر دارم اینک گُلزمینے	بہار آئین سوادِ دل نشینے
سخن را نازش مینو قماشی	ز گلبانگِ ستایشہاے کاشی
تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور	بہشتِ خرم و فردوسِ معمور
بنارس را کسی گفتا کہ چینست	ہنوز از گنگ چینش بر جبینست

بخوش پرکاری طرز وجودش
ز دهلی میرسد هر دم درودش

بنارس را مگر دیدست در خواب
که میگردد ز نهرش در دهن آب

تناسخ مشربان چون لب کشایند
بکیش خویش کاشی را ستایند

که هر کس کاندران گلشن بمیرد
دگر پیوند جسمانی نگیرد

چمن سرمایهٔ امید گردد
بمردن زندهٔ جاوید گردد

زهی آسودگی بخشش روانها
که داغ جسم می شوید ز جانها

شگفتی نیست از آب و هوایش
که تنها جان شود اندر فضایش

بیا ای غافل از کیفیت ناز
نگاهی بر پری زادانش انداز

همه جانهای بی تن کن تماشا
ندارد آب و خاک این جلوه حاشا

درین دیرینه دیرستان نیرنگ
بهارش ایمن است از گردش رنگ

چه فروردین چه دیماه و چه مرداد
بهر موسم فضایش جنت آباد

بهاران در شتا و صیف ز آفاق
بکاشی میکند قشلاق و ییلاق

بود در عرض بال افشانی ناز
خزانش صندل پیشانی ناز

بتسلیم هوای آن چمن زار
ز موج گل بهاران بسته زنار

فلک را قشقه اش گر بر جبین نیست
پس این رنگینی موج شفق چیست

سوادش پای تخت بت پرستان
سراپایش زیارتگاه مستان

عبادتخانهٔ ناقوسیانست
همانا کعبهٔ هندوستانست

بتانش را ہیولے شعلۂ طور
سراپا نور ایزد چشم بد دور

میانہا نازک و دلہا توانا
ز نادانی بکار خویش دانا

ز رنگین جلوہا غارت گر ہوش
بہار بستر و نوروز آغوش

ز تاب جلوۂ خویش آتش افروز
بتان بت پرست و برہمن سوز

رسانده از ادائی شست و شوئے
بہر موجے نوید آبروئے

بمستی موج را فرمودہ آرام
ز لغزے آب را بخشیدہ اندام

ز بس عرض تمنا می‌کند گنگ
ز موج آغوشہا وا میکند گنگ

مگر گوئی بنارس شاہدی ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

بگنگش عکس تا پرتو فگن شد
بنارس خود نظیر خویشتن شد

شبے پرسیدم از روشن بیانے
ز گردشہائے گردون راز دانے

ز ایمانہا بجز نامی نماندہ
بغیر از دانہ و دامے نماندہ

پدرہا تشنۂ خون پسرہا
پسرہا دشمن جان پدرہا

برادر با برادر در ستیزست
وفاق ز شش جہت رو در گریزست

بدین بے پردگیہائے علامت
چرا پیدا نمی گردد قیامت

سوئے کاشی باندازِ اشارت
تبسم کرد و گفتا این عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا
کہ از ہم ریزد این رنگین بنا را

بلند افتادہ تمکینِ بنارس
بود بر اوج او اندیشہ نارس

الا اے غالب کار اوفتادہ — ز چشم یار و اغیار اوفتادہ

ز خویش و آشنا بیگانہ گشتہ — جنون گل کردہ و دیوانہ گشتہ

چہ محشر سر زد از آب و گل تو — دریغا از تو و آہ از دل تو

چہ جوئی جلوہ زین رنگین چمنہا — بہشت خویش شو از خون شدنہا

چو بوئے گل ز پیراہن برون آئے — بآزادی ز بند تن برون آئے

فرو ماندن بکاکشی نارسائیست — خدا را این چہ کافر ماجرائیست

بکاکشی بختی از کاشانہ یاد آر — درین جنت ازان ویرانہ یاد آر

دریغا در وطن وا ماندۂ چند — بخون دیدہ زورق راندۂ چند

ہوس را پائی در دامن شکستہ — بامید تو چشم از خویش بستہ

ہمہ در خاک و خون افگندۂ تو — بحکم بیکسیہا بندۂ تو

سر و سرمایہ غارت کردۂ تو — ز تو نالان ولے در پردۂ تو

از آنانت تغافل خوشنمانیست — بدرغ شان ہوائے گل روانیست

ترا اے بیخبر کاریست در پیش — بیابانی و کہساریست در پیش

دل از تاب بلا بگداز و خون کن — ز دانش کار نکشاید جنون کن

نفس تا خود فرو ننشیند از پای — دمی از جادہ پیمائی میاسای

شرار آسا تن آمادہ برخیز — بیفشان دامن و آزادہ برخیز

مثنوی رنگ و بو (۴)

غالب افسرده دل و جان بیا — بے سر و پا در صف رندان بیا

آن اثر پردهٔ سازت چه شد — زمزمهٔ خارا گدازت چه شد

در هوس جاه فرو رفتهٔ — حیف که در چاه فرو رفتهٔ

تا پئی نیرنگ و فن افتادهٔ — از نظر خویشتن افتادهٔ

آه ز دنیا طلبیهائے تو — واین همه ابرام و تقاضائے تو

گرمی خونت که ازین پیش بود — صرف برانداختن خویش بود

آتش هنگامه بجان داشتے — داغ مغان شیوه بتان داشتے

چشم پریشان نظرے داشتی — جلوه بهر رهگذرے داشتی

زان همه اجزائے زمانیکه رفت — وان همه خونابه فشانی که رفت

هر چه کنون میرسدم در نظر — شاهد و شعر است و شراب و شکر

آن همه دیوانگی و جاهلی — وین همه ناکامی و بیحاصلی

آن همه بدمستی و تن پروری — وین همه هشیاری و افسونگری

آن همه بیراهه روی هائے تو — وین همه بیصرفه دویهائے تو

نیمهٔ شب از عمر تو در خواب رفت — نیمه به پیمودن مهتاب رفت

بین که درین کارگه پیچ پیچ — ماحصل سعی تو هیچست هیچ

نقد تمنا بکف فتادہ گیر | خسروی دست بہم دادہ گیر
خلق اگر روس دگر روم گیر | ہر چہ بجز حق ہمہ معدوم گیر
ساقی ہمت کہ صلا میدہد | بادہ ز خمخانۂ لا میدہد
ہمت اگر بال کشائے کند | صعوہ تواند کہ ہمائے کند
نیّر توفیق اگر بر دمد | لالہ عجب نیست کز اخگر دمد

مثنوی موسوم بباد مخالف(۵)

اے تماشائیانِ بزمِ سخن | وے مسیحا دمان نادرہ فن
اے گرانمایگانِ عالمِ حرف | خوش نشینانِ این بساطِ شگرف
اے سخن پرورانِ کلکتہ | وے زبان آورانِ کلکتہ
اے رئیسان این سوادِ عظیم | وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
ہمچو من آرمیدۂ این شہر | بہر کارے رسیدۂ این شہر
اسد اللہ بخت برگشتہ | در خم و پیچ عجز سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہمان شماست | لب بخن ریزہ چینِ خوان شماست
بتظلم رسیدہ است اینجا | بامید آرمیدہ است اینجا
آرمیدن دہید روزی چار | خستہ را بسایۂ دیوار
چون شنیدم کہ نکتہ پردازان | قدردانان و انجمن سازان

از من آزرده اندازان پاسخ
به نیایش بخاک سودم رُخ

نفسِ من بجمع درنگرفت
کس نیازم بهیچ برنگرفت

خاک پائے سخنورانستم
دوستان راز کہترانستم

با بزرگان نیازہا دارم
ہم بدین شیوہ نازہا دارم

بندہ ام بندہ مہرنان را
رمز فہمان و نکتہ دانان را

نہ ز آویزشش بیان ترسم
من و ایمان من کزان ترسم

کہ پس از من بسالہاے دراز
بزبان ماند این حکایت باز

کہ سفیہے رسیدہ بود اینجا
چند روز آرمیدہ بود اینجا

با بزرگان ستیزہ پیش گرفت
زحمتی داد و راہ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئی بود
بیحیائے و ہرزہ گوئی بود

آہ ازان دم کہ بعدِ رفتنِ من
خون دلی بود بگردنِ من

تا بُوَم رنج دوستان باشم
بر دلِ انجمن گران باشم

شاد گردند کز میان بروم
آورخ از من کہ من چنان بروم

تاب ہنگامہ ام خدارا نیست
مہربانان دلست خارا نیست

زلہ بردار کس چرا باشم
من ہُمایم مگس چرا باشم

فیضے از صحبتِ تسیم نیست
رشک بر شہرتِ قتیلم نیست

مگر آنان کہ پارسے دانند
ہم برین عہد رائے و پیمانند

که ز اهل زبان نبود قتیل
هرگز از اصفهان نبود قتیل

لاجرم اعتماد را نسزد
گفته اش استناد را نسزد

کین زبان خاص اهلِ ایرانست
مشکل ما و سهل ایشانست

اے تماشائیانِ ژرف نگاه
هان بگوئید حسبةً لله

که چسان از حزین به پیچم سر
آن بجا دودمے بدهر سمر

دل دهد کز اسیر برگردم
زان نو آئین صفیر برگردم

دامن از کف کنم چگونه رها
طالب و عرفی و نظیری را

خاصه روح و روانِ معنی را
آن ظهوری جهان معنی را

طرز اندیشه آفریدهٔ اوست
در تن لفظ جان دمیدهٔ اوست

فتنهٔ گفتگوے اینانم
مست لای سبوے اینانم

آنکه طے کرده این مواقف را
چه شناسد قتیل واقف را

لیک با آن همه که این دارم
گنج معنی در آستین دارم

دِل و جانم فدائے احباب ست
شوق وقف رضائے احباب ست

از من نارسائی ما هیچمدان
معذرت نامه ایست زی یاران

بو که آید ز عذر خواهیِ ما
رسم بزم و بیگناہے ما

آشتی نامهٔ ودادپیام
ختم شد والسلام والاکرام

بیانِ نموداریِ شانِ نبوت و ولایت

مثنوی ششم

بعد حمد ایزد و نعتِ رسولؐ — می نگارم نکتۂ چند از اصول

تا سوادش بخشد اندر رسم و راه — دیدہ ور را سرمۂ اعمیٰ را نگاہ

نیستی عارف کہ گویم خود مباش — بد مبین و بد مگوئی و بد مباش

بد شمردی رہروانِ پیش را — رہرو چالاک گفتے خویش را

گر سفر اینست منزل گہ کجاست — لا الٰہ گفتی الا اللہ کجاست

ہست رسمِ خاص در ہر مرز و بوم — خود چہ میخواہی ز نفی این رسوم

نفیِ رسمِ کفر ما ہم مے کنیم — داد بادانش فراہم مے کنیم

نفیِ کفر آئینِ اربابِ صفاست — نفیِ فیض انبیاء تیرہ درا رسم کجاست

نفیِ رسم و رہ ہوا را مے کشد — نفیِ فیض ست اینکہ ما را مے کشد

اے گرفتار خم و پیچ خیال — نفیِ بے اثبات نبود جز ضلال

وین کہ میگوئی توانا کردگار — چون محمدؐ دیگرے آرد بکار

نغز گفتی نغز تر باید شنفت — آنکہ پنداری کہ ہست اندر نہفت

گرچہ فخر دودۂ آدم بود — ہم بقدر خاتمیت کم بود

صورت آرائشِ عالم نگر — یک و یک مہر و یک خاتم نگر

یک جہان تا ہست یک خاتم بس است
قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے
ہم بُوَد ہر عالمے را خاتمے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃٌ للعالمینے ہم بُوَد

کثرتِ ابداعِ عالم خوبتر؟
یا بیک عالم دو خاتم خوبتر؟

در یکے عالم دو تا خاتم مجوی
صد ہزاران عالم و خاتم بگوی

غالب این اندیشہ نپذیرم ہمی
خردہ ہم بر خویش می‌گیرم ہمی

ہر کرا با سایہ نپسندد خدا
ہمچو اوئی نقش کے بندد خدا

منفرد اندر کمالِ ذاتیست
لاجرم مثلش محالِ ذاتیست

تقریظ آئین اکبری (۱۰)

مژدہ یاران را کہ این دیرین کتاب
یافت از اقبالِ سیّد فتح باب

دیدہ بینا آمد و بازو قوے
کہنگے پوشید تشریفِ نوے

وینکہ در تصحیحِ آئین رائی اوست
ننگ و عارِ ہمت والائی اوست

ہر چنین کاری کہ اصلش این بود
آن ستاید کش ریا آئین بود

من کہ آئینِ ریا را دشمنم
در وفا اندازہ دانِ خود منم

گر بدین کارش نگویم آفرین
جای آن دارد کہ جویم آفرین

گر ز آئین میرود با ما سخن
چشم بکشا و اندرین دیرِ کہن

صاحبانِ انگلستان را نگر | شیوهٔ و انداز اینان را نگر
زین هنرمندان هنر بیشی گرفت | سعی بر پیشینیان پیشی گرفت
حقِ این قوم است آئین داشتن | کس نیارد ملک بِه زین داشتن
آتشی کز سنگ بیرون آورند | این هنرمندان ز خس چون آورند
تا چه افسون خوانده اند اینان بر آب | دود کشتی را همی راند در آب
گه دخان کشتی به جیحون می برد | گه دخان گردون بهامون می برد
نغمه ها بے زخمه از ساز آورند | حرف چون طائر بپرواز آورند
هین نمی بینی که این دانا گروه | در دو دم آرند حرف از صد کروه
رو به لندن کاندران رخشنده باغ | شهر روشن گشته در شب بے چراغ
کاروبار مردمِ هشیار بین | در هر آئین صد نو آئین کار بین
پیش این آئین که دارد روزگار | گشته آئینِ دگر تقویم پار
چون چنین گنج گهر بیند کسے | خوشه زان خرمن چرا چیند کسے
هر خوشی را خوشتری هم بوده است | گر سری هست افسری هم بوده است
مبداء فیاض را مشمر بخیل | نور میریزد رطب بار از نخیل
مرده پرور دن مبارک کار نیست | خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

غالب آئین خموشی دلکش است
گرچه خوش گفتی نگفتن هم خوش است

مثنوی اَبرِ گُہربار[1]

سپاسے کزو نامہ نامی شود سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کہ آغاز گفتار زوست سخن چون خط از رُخ نمودار زوست
سپاسے کہ تا لب از وکام یافت روانہا بدان رامش آرام یافت
خدارا سزد کز درون پروری بدین شیوہ بخشد شناساوری
خدائی کہ زانگونہ روزی دہد کہ ہم روزی و ہم دو روزی دہد
خرد جنسِ ہستی فروشندگان دہد مزد بیہودہ کوشندگان
رُباید دِل اما ز دِلدادگان کشد ناز لیکن ز افتادگان
جہان داور دانش آموزگار بہ خور روشنائی دہِ روزگار
بہر لب کہ جوئی نوائی ازوست بہر سر کہ بینی ہوائی ازوست
اگر دیوسار یست بیہوش وہنگ کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ
بہ بُت سجدہ زان رو روا داشتہ کہ بُت را خداوند پنداشتہ
وگر خیرہ چشمیست نیّر پرست بُدر دِمی از جام اندیشہ مست

بمهرش از آن راه جنبیده مهر / کزین روزنش دوست بنموده چهر

گروهی سراسیمه در دشت و کوی / خداوند جوی و خداوند گوی

ز رسمی که خود را بر آن بسته اند / به یزدان پرستی میان بسته اند

نظرگاهِ جمع پریشان یکیست / پرستنده انبوه و یزدان یکیست

جهان چیست آئینهٔ آگهی / فضائی نظرگاهِ وَجهُ اللهی

ز هر ذره کارے به تنهائیش / نشان باز یابی ز یکتائیش

مُنَاجَاتْ

خدایا زبانی که بخشیدهٔ / به نیروئی جانی که بخشیدهٔ

دمادم بجنبش گر آید همے / ز راز تو حرفے سراید همی

ندانم که پیوند حرف از کجاست / درین پرده لحنی شگرف از کجاست

گر از دل شناسم جنون بیش نیست / که آن نیز یک قطره خون بیش نیست

خرد را سگالم که نیرو دهد / خود او راز من حیرتی رو دهد

ز هر پرده رنگے که گیرد کشاد / چنان دلکش افتد که بی آن مباد

به یزدانیان فرّهٔ ایزدی / بیونانیان بهرهٔ بخردی

بساقی خرامی که از دلبرے / ز شاهد بَرَد دل بساقی گری

بشاهد ادائی که از سر خوشے / بساقی دهد داروئے بیهشے

هر آئینه ما را که تر دامنیم   ز دیوانگی با خرد دشمنیم
ز آلودگیها گرانے بُوَد   همه سختی و سخت جانے بُوَد
اگر خوار و گر نارواییم ما   بباغ تو برگ گیائیم ما

بروزی که مردم شوند انجمن   شود تازه پیوند جان ها به تن
به بخشائے برناکیهائے من   تهیدست و درمانده ام وائے من
بدوش ترازو منه بار من   نسنجیده بگذار کردار من
بگردار سنجے میفزائے رنج   گرانبارئے درد غم م بسنج
اگر دیگران را بود گفت و کرد   مرا مایهٔ عمر رنجست و درد
چه پرسی چو آن رنج و درد از تو بود   غمی تازه در هر نورد از تو بود
فرو هل که حسرت خمیر منست   دم سرد من زمهریر منست
وگر همچنین ست فرجام کار   که می باید از کرده راندن شمار
مرا نیز یارائے گفتار ده   چو گویم بر آن گفته زنهار ده
درین خستگی پوزش از من مجوی   بود بندهٔ خسته گستاخ گوی
دل از غصه خون شد نهفتن چه سُود   چو نا گفته دانی نه گفتن چه سُود
همانا تو دانی که کافر نیَم   پرستار خورشید و آذر نیَم
نکشتم کسے را براهزنے   نبردم ز کس مایه در رهزنے

گرمی که آتش بگورم از وست — بهنگامه پروازِ مورم از وست

من اندوهگین و می اندُه ربای — چه میکردم اے بندهٔ پروردگار خدای

حسابِ می و رامش و رنگ و بوے — ز جمشید و بهرام و پرویز جوے

که از باده تا چهره افروختند — دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند

نه از من که از تابِ می گاه گاه — بدریوزه رُخ کرده باشم سیاه

نه بستان سرائی نه میخانهٔ — نه دستان سرائی نه جانانهٔ

نه رقصِ پری پیکران بر بساط — نه غوغائی رامشگران در رباط

شبانگه به می رهنمونم شدی — سحرگه طلبگارِ خونم شدی

تمنائے معشوقهٔ باده نوش — تقاضائے بیهودهٔ میفروش

چه گویم چو هنگام گفتن گزشت — ز عمرِ گران مایه بر من گزشت

بسا روزگاران بدلداد گے — بسا نوبهاران به بی بادگے

بسا روز باران و شبهائی ماه — که بودست بی می بچشمم سیاه

افقها پُر از ابرِ بهمن مهے — سفالینه جامِ من از می تهے

جهان از گل و لاله پُر بوی و رنگ — من و حجره و دامنی زیرِ سنگ

دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبود — باندازهٔ خواهشِ دل نبود

اگر یافتم رشتهٔ گوهر شکست — و گر یافتم باده ساغر شکست

بنا سازگاری ز همسایگان — بسرمایه جوئی ز بیمایگان

مرا از منت ناکسان زیر خاک — لب از خاکبوس خسان چاک چاک
به گیتی ندرم بلینوا داشتے — دلم را اسیر ہوا داشتے
نہ بخشندہ شاہی کہ بارم دہد — بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چون پیل زانجا برانگیز می — زرش برگدایان فرو ریزمی
نہ نازک نگاری کہ نازش کشم — بہر بوسہ زلف درازش کشم
چو زان غمزہ نیشی بدل برخورد — رگ جان غم نوک نشتر خورد
بدان عمر ناخوش کہ من داشتم — زجان خار در پیرہن داشتم
چو دل زین ہوسہا بجوش آیدی — ز دل بانگ خونم بگوش آیدی
ہنوزم ہمان دل بجوش اندرست — ز دل بانگ خونم بگوش اندرست
چو آن نامرادے بیناد آیدم — بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلی را کہ مستہ شکیبد بباغ — در آتش چہ سوزی بسوزیدہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور — کجا زہرۂ قبح و جام بلور
دم شبر و ہیاہی مستانہ کو — بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دران پاک میخانہ بیخروش — چہ گنجائی شورش نای و نوش
بہ مستی ابر و باران کجا — خزان چون نباشد بہاران کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ — غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار

گریزد دم بوسه ایمنش بجا | نزیبد بسوگند دینش بجا
بَرَد حکم و بنود لبش تلخ گوئی | دہد کام و بنود دلش کام جوئی
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو | بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند دلالۂ | نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل | ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چو پرسش رگی را بکاوو ز دل | دو صد دجلہ خونم تراود ز دل
بہر جرم کز روئی دفتر رسد | ز من حسرتے در برابر رسد
بفرمای کاین داوری چون بود | کز اجرم من حسرت افزون بود
بہ بندِ امید استواری فرست | بہ غالب خطِ رستگاری فرست

نعت

درودی بعنوان دفتر نویس | بدیباچہ نعتِ پیمبر نویس
محمد کز آئینۂ روئے دوست | جز نیش ندانست دانا کہ اوست
زہی روشن آئینۂ ایزدے | کہ دروی نگنجیدہ زنگ خودے
ز رازِ نہاں پردہ برزدہ | ز ذاتِ خدا معجزے سرزدہ
خہی قبلۂ آدمے زادگان | نظرگاہِ پیشین فرستادگان
بندے دہ کعب بالائے و | گرامے کُنِ سجدہ سیمائے او

منقبت

هزار آفرین بر من و دین من | کہ منعم پرستیت آیینِ من
نبی را پذیرم بہ پیمانِ او | خدا را پرستم بہ ایمانِ او
خدایش رُوا نیست ہرچند گفت | علیؑ را توانم خداوند گفت
پس از شاہ کس غیرِ دستور نیست | خداوندِ من از خدا دُور نیست
نبیؐ را اگر سایہ صورت نداشت | تردّد ندارد ضرورت نداشت
دو پیکر دو جا در نمود آمدہ | اثرہا بیک جا فرود آمدہ
دو فرخندہ یارِ گرانمایہ بین | دو قالب زیک نور و یک سایہ بین
علی راست بعد از نبیؐ جاے او | ہمان حکمِ کُل دارد اجزاے او
ہمانا پس از خاتم المرسلینؐ | بُود تا بہ مہدی علی جانشین
مرا ناسزا گفتن آیین مباد | لبِ من رگِ سازِ نفرین مباد
بود گرچہ با ہر کسم سینہ صاف | من و ایزد البتہ نبود گزاف
کہ تا کینہ از مہر بشناختم | بکس غیرِ حیدر نپرداختم
جوانی برین در بسر کردہ ام | شبی در خیالش سحر کردہ ام
بود گرچہ ثابت کہ چون جان دہم | علی گویم و جان بیزدان دہم
بہ ہند و عراق و بہ گلزار و دشت | بسوی علی باشدم بازگشت

مغنی نامہ

مغنی دگر زخمہ بر تار زن — گل از نغمۂ تر بدستار زن
بہ پردازش آن گل افشاں نوا — بگویم غم از دل دل از من ربا
دل از خویش بردار و بر ساز نہ — ہم از خویش گوشی بر آواز نہ
ز گنجینۂ ساز بردار بند — درین پردہ نقشے بہنجار بند
سخن گرچہ گنجینۂ گوہر ست — خرد را ولی تابشی دیگرست
ہمانا بشبہاے چوں پر زاغ — نہ بینی گہر جز بروشن چراغ
بہ پیرایش این کہن کارگاہ — بدانش توان داشت آئین نگاہ
بود بستگی رنگ داز خرد — سر مرد خالے مباد از خرد
خرد چشمۂ زندگانے بود — خرد را بہ پیری جوانے بود
فروغ سحرگاہ روحانیان — چراغ شبستان یونانیان
نخستین نمودار ہستی گرائے — خرد بود کامد سیاہی زدائے
ز ہر ذرہ کان آفتابے شود — نگہ سرخوشش کامیابی شود
خرد جویہ ار خود بود مرگ من — بہ ہستی خرد بس بود برگ من
سخن گرچہ پیغام راز آورد — سرود ارچہ در اہتزاز آورد
خرد داند این گوہرین درکشاد — ز مغز سخن گنج گوہر کشاد

خرد داند آن پرده بر ساز بست — برامش طلسمے ز آواز بست

بدانش توان پاس دَم داشتن — شمارِ خرامِ قلم داشتن

ازین باده هر کس که سرمست تر — بافشاندن گنج تردست تر

بمستی خرد رہنمائے خودست — رُود گر ز خود ہم بجائے خودست

زہے کیمیائے معانی سخن — بخود زندۂ جاودانی سخن

سخن باده اندیشه مینائے اُو — زبان بے سخن لائے پالائے اُو

بہ پیمودن باده پیمانه گوش — خرد ساقی و خود خرد جرعه نوش

ز گنجی که بینش بویرانه ریخت — در آفاق طرح پریخانه ریخت

زدودن ز آئینه زنگار برد — ز دانش نگه ذوقِ دیدار برد

خرد کرده عنوانِ بینش درست — رقم سنجِ آفرینش درست

فروغِ خرد فرّهٔ ایزدیست — خدا ناشناسی ز نابخردیست

نظر آشنا روئی دانائیش — عمل رو شناسِ توانائیش

ز اندیشه دم زد نظر نام یافت — بکردار رفت ز اثر کام یافت

بچشمِ سبکسیر ازو گوش تاب — گرانپائے خواهش ازو در حساب

غضب را نشاطِ شجاعت دهد — ز خواهش بعفّت قناعت دهد

باندازه زور آزمائی کند — خورد باده و پارسائی کند

بدین جنبش از مرگ بخشد نجات — باندیشه پیماید آب حیات

منشهای شایسته عادت شود — نظر کیمیای سعادت شود

بدانش غم آموزگار منست — خزان عزیزان بهار منست

غمی کز ازل در سرشت منست — بود دوزخ اما بهشت منست

بغم خوشدلم غمگسارم غمست — به بیدانشی پرده دارم غمست

زمین جوی در بد نکو زیستن — جگر خوردن و تازه رو زیستن

درشتی بنرمی زبون داشتن — رسد گر ستم غمزه پنداشتن

بعجز از درون سو جگر سوختن — بناز از برون سو رخ افروختن

بدریوزه گنجینه اندوختن — بیازیچه دانائی آموختن

شگفتن ز داغی که بر دل بود — نهفتن شرارے که در دل بود

بدین جاده کاندیشه پیموده است — غم خضر راه سخن بوده است

نظامی کشد ناز تابم عجب — زلالی بود خفته خوابم کجا

نظامی بحرف از سروشش آمده — زلالی از و در خروشش آمده

من از خویشتن با دل دردمند — نوای غزل بر کشیده بلند

نباشم گر از گنجه گنجم بس ست — بغم گر چنین پرده سنجم بس ست

خود از درد بیتاب خود چاره جوی — خود آشفته مغز و خود افسانه گوی

چراغی که بی روغن افروختم — دلی بود کز تاب غم سوختم

نشاید که من شکوه سنجم ز غم — خورد رنج از من چو رنجم ز غم

غم دل زمن مرحبا جوئی باد　　دلم زار و لب مرحبا گوئی باد

ساقی نامہ

بیا ساقی آئینِ جم تازہ کن　　طراز بساطِ کرم تازہ کن

مبادا نظامی ز راہت برد　　بدستان شکوخا نقاہت برد

فریبش مخور چون می آشام نیست　　ستمدیدۂ گردش جام نیست

ورع پیشہ مسکین چہ داند ترا　　بہ آرایش نامہ خواند ترا

رضا جوئے من شو کہ ساغر کشم　　گرم نیل و جیحون دہی درکشم

اگر زود مستم پریشان نیم　　دگر دیر مستم گرانجان نیم

ہمانا تو دانستہ ئی کز دو سال　　ننوشم می الا بہ بزم خیال

ز لب تشنگی چون بمی در خورم　　تو کمتر خور امروز تا برخورم

ز خود رفتہ ترکیست ہندوی تو　　عجب بنود از خوبی خوی تو

کہ جوئی رضائی ز خود رفتۂ　　دہی می بہ ترک جگر تفتۂ

ندانی پس از روزگاری دراز　　بمی کردہ ام دست یاری دراز

در اندیشہ محوِ تلاشم ہنوز　　قدح سازد ساقی تراشم ہنوز

می خویش و جام سفالِ خودم　　نہ ساقی کہ من ہم خیالِ خودم

مرا دستگاہِ مے و شیشہ کو　　نشاطی چنین جز در اندیشہ کو

مَی و شیشه بگذار و بگذر ز من — همانا نه من بلکه این انجمن

نه از من ز سعدیؔ شنو تا چه گفت — سخن گفت در پرده اما چه گفت

رهِ عقل جز پیچ در پیچ نیست — برِ عارفان جز خدا هیچ نیست

دگر رهروی گوید از زیرِ دلق — که حقیقت محسوس و معقول خلق

خیالی در اندیشه دارد نمود — همان غیب غیب است بزمِ شهود

نشانهائے رازِ خیالِ خودیم — نواهائے سازِ خیالِ خودیم

تصوف نزیبد سخن پیشه را — سخن پیشه رندگر اندیشه را

نشان مند این روشنائی نه — غزل خوان و مخمورِ سنائی نه

غزل گر نباشد نوائے دگر — سرِ دل سلامت هوائے دگر

غزل گر نلال آرد افسانه گوی — کهن داستانهائی شاهانه گوی

من آن خواهم اے لاابالی خرام — کزین پویه خوشتر سگالی خرام

ز شاهان سخن گر گهر سفتنست — سخن گفتن از حق جگر سفتنست

ننالی ز غم گر جگر سفته شد — سخنهائے حق بین که چون گفته شد

ننالم ز پیری جوانم برائے — هنوزم بود طبع زور آزمائے

سخن سنج معنی طرازم هنوز — به شیوائی شیوه نازم هنوز

ز فردوسیم نکته انگیز تر — ز مرغِ سحر خوان سحر خیز تر

به مستی توان نغز گفتار بود — مرا باید از خویش هشیار بود

قصیدہ اوّل[1] در توحید

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفی و خود در گماں انداختہ

دیدہ بیرون و درون ز خویشتن پُر وا نگہی
پردۂ رسم پرستش درمیان انداختہ

اے اساس عالم و اعیان بہ پیوند الف
ہمچنان بر صورت علم و عیان انداختہ

عاشقان در موقف دار و رسن وا داشتہ
غازیان در معرض تیغ و سنان انداختہ

رنگہا در طبع ارباب قیاس آمیختہ
نکتہ ہا در خاطر اہل بیان انداختہ

تا علاج خستگے آسائش دیگر دہد
خارہا در رہ گزار میہمان انداختہ

اے عمل را دادہ فرجام مکافات عمل
گرچہ دانا شرح آنرا بر زبان انداختہ

قصیدہ دوم[2] در نعت

مرا دلیست بہ پس کوچۂ گرفتاری
کشادہ روئے تراز شاہدان بازاری

ز طوطیان شکر خا مگوی وا زمن جوی
نشاط زمزمہ و لذت جگر خواری

قصیدهٔ سوم (۳) در نعت

آن بلبلم که در چمنستان بشاخسار — بود آشیان من شکن طرهٔ بهار

همواره ذوق مستی و لهو و سرود و سور — پیوسته شعر و شاهد و شمع و می و قمار

با کیسه در خصومت و با کاسه در لجاج — رندان پاکباز و شگرفان شاد خوار

بدمستی شبینه و خواب سحرگهی — رنگینی سفینه و اشعار آبدار

چشم گشوده ند بحر دار ہائے من — زاینده نا امیدم و از رفته شرمسار

قصیدهٔ ششم (۶) در منقبت

نظارهٔ خوبان و می و نغمه حرامست — دیدیم و شنیدیم سَمِعنَا و اَطَعنَا

با این همه هر جا کشد آهنگ خرابی — سرگرمی شوقی که بود حوصد فرسا

با نغمهٔ مطرب نتوان شد متعصب — از جلوهٔ ساقی نتوان کرد تبرا

شوقست که چون نشاهٔ توحید رساند — از دار بَرَد پایهٔ منصور ببالا

شوقست که فرهاد از و مرده بسختی — شوقست که مجنون شد از و بادیه پیما

شوقست که مرآت مراد ده صیقل — شوقست که زو طوطی طبعم شده گویا

شوقست که ز اعجاز اثرهائے قبولش — آئینهٔ پیدائی حرفست درقها

قانع بسخن نیستم و باک ندارم — ز خویش سپاس ست و نه از غیر محابا

نظارگیٔ جلوۂ سرا خیالم   در آئینۂ چشم حسود و دلِ اعدا

زاویزشِ دونان زسخن باز نمانم   سیلاب مرزین خس وخاشاک چہ پروا

شوقم ہمہ رازست من و عربدہ ہرگز   سوزم ہمہ سازست من و شکوہ مبادا

قصیدہ یازدہم (۱۱) در منقبت حضرت عباسؑ ابن علیؑ

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را   خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

آزادہ روی در نظرم خوار و زبوں کرد   توقیع جہاں بخشیٔ شاہان عجم را

ہمت نکشد ننگ نکونامیٔ احسان   برخیز و بہ بازیچہ فرو ریز درم را

رو ہمت ازآن تشنہ جگر جوئی کہ از مہر   بر تشنگیٔ شاہ فدا ساختہ دم را

قصیدہ دوازدہم (۲) در منقبت امام دوازدہم (۲)

پست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد   آئین دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مردست مرد ہرچہ کند بے خطر کند   رادست راد ہرچہ دہد رائیگاں دہد

گلزار را اگر نہ ثمر گل بہم نہد   درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد

گنج سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر   وانگہ کلید گنج بدستِ زباں دہد

تا روز خاک تیرہ نگردد ز رشک چرخ   رخشانیٔ ستارہ بہ ریگِ رواں دہد

تا آدمے ملال نگیرد ز یک ہوا   سرما و لو بہار و تموز و خزاں دہد

هم در بهار گل شگفاند چین چین | تا راحت مشام و نشاط روان دهد
هم در تموز میوه فشاند طبق طبق | تا آرزوے کام و مراد دهان دهد
نظارهٔ متاع اثر بر دکان نهد | اندیشه را شمار گهر در نهان دهد
آنرا که بخت دسترس بذل مال نیست | طبع سخن رس و خرد خرده دان دهد
آنرا که طالع کف گنجینه پاش نیست | نعم البدل ز خامهٔ پروین فشان دهد

قصیدہ سیزدہم (۱۳) در مدح اکبر شاہ و شاہزادہ سلیم

حکایتیست اگر بشنوے فرو گویم | بشوخیے که چکد خون ز جبههٔ تسلیم
اگر ز اکبر شه بود بهره ور عرفی | دگر ز شاہجهان بود مایه دار کلیم
نه کمترم ز حریفان به فن شعر و سخن | نه کمتری ز نیاکان بجود و خلق عظیم
بدیده داد مرا و ترا نبوده نظیر | به ترک و برگ مرا و ترا نبوده سهیم
چه نیک راے ارسطو چه شاہ اسکندر | چه بیدپاے برهمن چه راے دابشلیم
شهود همت تست آنکه در مشیمهٔ غیب | دهد به قطرهٔ آبی نمود دُرّ یتیم
صریر کلک منست آنکه در نشیمن قدس | به زُهره شیوهٔ رامشگری کند تعلیم
ز گرمی نفس خویش میتوانم داد | برائے سکهٔ نامت گدازش زر و سیم
به آستین گهر ریز میتوانے کرد | فراز بام امیدم ظهور صبح و نسیم
مرا بشیوهٔ جادو دمی همال محال | ترا به پایهٔ شاهنشهی عدیل عدیم

روا مدار که هم در وطن دودل باشم
چو خسته رهروی در کاروان سرائے مقیم

چهار چیز بود آنکه جاودان باشد
بحکم آنکه ز اسمائے اوست حیِّ قدیم

عطیهٔ بخششِ مهر و عطا پذیریِ ماه
بقائے پادشه و عیش شاهزاده سلیم

قصیدهٔ پانزدهم (۱۵) در مدح بهادر شاه ظفر

زہے ز خویش نشانِ کمالِ صنعِ اله
سراج دین نبی بو ظفر بهادر شاه

محیط بخشش و دریا کف و سحاب نوال
قمر لوائے و فلک خرگه و ستاره سپاه

رئیس تاجوران خسرو جهان داور
دلیل راه روان مرشدِ خدا آگاه

ز حق عطیه پذیرد چو ماهتاب ز مهر
به خلق بهره رساند چو آفتاب بماه

چو او نکرده کس از اهل دین بفرش حصیر
نشاط شاهی و فرماندهی خداست گواه

چو او نگفت کس از خسروان بروئے سریر
حدیث فقر و فنا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

بیار گه ز ستم خانهٔ سپهر خراب
ندیم شه نشوم روئے روزگار سیاه

چه دل نهم به گهرپاشیٔ سخن چو مرا
هزار آبله بردل بُوَد زگرمیٔ آه

چه سر کنم روش مدح گستری چو مرا
به بزم خسرو گیتی ستان نباشد راه

ز کار رفته دل و دست من چنان که مرا
نمانده شادیٔ پاداش و رنج یادافراه

نه از تو لطف و نه از حق مدد زہے حرماں
نه تاب شکوه نه جائے سخن معاذ الله

نباشدم صله مقصود مدح خوانِ توام
بدیں ذریعه گر یادم آوری گهه گاه

وگر عطیهٔ فرستی شگفت هم نبود   که می رسد ز نمِ ابر تازگی به گیاه

بچشمِ کم منگر گرچه خاکِ راهِ توام   که آبروئے دیارم دریں خلافت گاه

بانجه فیض ز مبداء فزودم از اسلاف   که بوده ام قدسے دیر تر بدین درگاه

نزولِ من بجهان بعد یکهزار و دویست[۲]   ظهورِ سعدی و خسرو بششصد[۶۵۰] و پنجاه

کنون تو شاهی و من مدح گوی تعالی الله   گزشت دورِ نظیری و عهدِ اکبر شاه

به فنِ شعر چه نسبت به من نظیری را   نظیرِ خود بسخن هم منم سخن کوتاه

سخن سرائیِ غالب بس است بر هم دعاست   اجابت از حق و خواهشِ بندهٔ درگاه

قصیده شانزدهم (۱۶) در مدح بهادر شاه ظفر

ردیف شعر ازان کردم اختیار گره   که از منست بر ابروئے شهریار گره

گره کشائے رموزِ خرد بهادر شاه   که پیشِ ناخنِ تدبیرِ اوست خوار گره

بدلکشائیِ گفتارِ من که غالب را   مزن برشتهٔ امید زینهار گره

ازیں گره که بر ابرو زدی چرا ترسم؟   که در دولت ز صفا نیست پایدار گره

قصیده هفدهم (۱۷) در مدح بهادر شاه ظفر

گفتم حدیثِ دوست بقرآں برابر است   نازم به کفرِ خود که بایماں برابر است

بیدست گر نیم که هنوز از هوائے وصل   شوریست در سرم که بساماں برابر است

نے وعدہ نہ پرسش رانے، نہ شکوہ ‌‌ دانم ز نامہ کہ بہ عنواں برابرست

نے کف گرفتہ ساعد و نے لب بودہ بوس ‌‌ در ناخوشی وصال بہ ہجراں برابرست

ترک وجود گیر سخن در سجود چیست ‌‌ بگذر ز طاعتی کہ بعصیاں برابرست

در دیدۂ جریدہ روانِ یگانہ بیں ‌‌ کثرت بخواہہائی پریشاں برابرست

قصیدہ نوزدہم (۱۹) در مدح بہادر شاہ ظفر

دوش در عالمِ معنی کہ ز صورت بالاست ‌‌ عقلِ فعّال سراپردہ زد و بزم آراست

رفتم آشفتہ و سرمست و ہیں از لابہ و لاغ ‌‌ گفتم اینک دل و دیں گفت خوشت باد کجاست

گفتم اسرار نہانی ز تو پرسش دارم ‌‌ گفت جز محرمیٔ ذات کہ بیچون چراست

گفتمش چیست جہاں گفت سراپردۂ راز ‌‌ گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست

گفتم از کثرت و وحدت سخنی گوئی بہ رمز ‌‌ گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

گفتم آیا چہ بود کشمکش ردّ و قبول ‌‌ گفت آہ از سرایں رشتہ کہ در دست قضاست

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال ‌‌ گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست

گفتم آں خسرو خوبانِ سخن گوش نہد ‌‌ گفت گر گوش نہد ز ہرۂ گفتار کراست

گفتم از اہل ثنا گر خبری ہست بگوی ‌‌ گفت ایں قافلہ بے گرد رہ و بانگ دراست

گفتم افسوس کہ کمتر دہدم داد سپہر ‌‌ گفت خاموش کہ در داد نگنجد کم و کاست

گفتم آں بیت کہ ہموارہ سرائی از کیست ‌‌ گفت غالب کہ ہم از غالبِ آشفتہ نواست

گفتم از چیست کہ چوں شمع گدازد نفسم | گفت اے جان پدر روشنی طبع بلاست

قصیدہ بست و سوم (۲۳) در مدح بہادر شاہ ظفر

ما ہمانیم و سیہ مستی ہر روزہ ہمان | نہ شب جمعہ شناسیم نہ ماہ رمضان
مستیم را نہ بود نامہ سیاہے فرجام | مستیم را نبود بادہ پرستے عنوان
مستم اما نہ ازان بادہ کہ آید ز فرنگ | مستم اما نہ ازان بادہ کہ سازند مغان
للہ الحمد کہ در ساغر من ریختہ اند | مے بیرنگ ز میخانہ بے نام و نشان
ہمدریں فصل کہ مستانہ سخن می گزرد | نکتۂ چند سرایم ز دجوب و امکان
ہستی محض تغیر نہ پذیرد زنہار | حرف الآن کما کان ازیں صفحہ بخوان
ہمچنان در تتق غیب ثبوتے دارند | بوجودی کہ ندارند ز خارج اعیان
عالم از ذات جدا نبود و نبود جز ذات | ہمچو رازی کہ بود در دل فرزانہ نہان

قصیدہ بست و پنجم (۲۵) در مدح بہادر شاہ ظفر

در بہاران چمن از عیش نشانے دارد | برگ ہر نخل کہ بینی رگ جانے دارد
باد را راہ بہ خلوت کدۂ غنچہ چراست | گرنہ با شاہد گل راز نہانے دارد
باد چوں نوسفران در دم رفتن رقصد | آب چوں نکتہ وزن طبع روانے دارد
دہر گو بیند ندارد ز روش دانش و داد | ہر دارد کہ چو غالب ہمہ دانے دارد

نطق تنہا نبود مشق سخن را کافی | سخن اینست کہ ایں تیر کمانے دارد
ہمچو شاہد کہ تحاشی زند اندر آغوش | خار در دست من از ناز فغانے دارد
درد با زمزمۂ مردہ دلاں بو العجبیست | موج خوں جوئے دراں تن گروتے دارد
بے خزاں باد بہار تو علی ارغم جہاں | تا جہانست و بہاری و خزانے دارد

قصیدہ بست و ششم (۲۶) در مدح بہادر شاہ ظفر ۔

رہروان چوں گہر آبلۂ پا بینند | پاے را پایۂ فرق تر ثریا بینند
ہرچہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند | ہر در سینہ نہانست ز سیما بینند
راز زیں دیدہ وراں جوئے کہ از دیدہ ورے | نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی | جادہ چوں نبض تپاں در تن صحرا بینند
شرری راکہ بناگاہ بدر خواہد جست | زخمہ کردار بتار رگ خارا بینند
قطرۂ راکہ ہر آئینہ گہر خواہد بست | صورت آبلۂ بر چہرۂ دریا بینند
قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند | بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند
برہم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب | خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند
دل نہ بندند بہ نیرنگ دریں دیر دو رنگ | ہرچہ بینند بعنوانِ تماشا بینند
ہرچہ در سو توان یافت بہر سو یابند | ہرچہ در جا نتواں دید بہر جا بینند

قصیده بست و هفتم (۲۷) در مدح بهادر شاه ظفر

بیا و باده بهنگامه آشکارا خور | نماند راز نهان کز ترسی از غماز

بدست آنچه بهندوستان کشند از قند | هم از فرنگ بیار ار نباشد از شیراز

دعا بصورت شرط و جزا کهن رسم است | ز نسبت دل بچنین شیوه خامۂ طناز

برای شاه ز یزدان طلب کنم شش چیز | بصد هزار تضرع ز روئے عجز و نیاز

تن درست و دل شاد و طالع فرخ | شکوه وافر و ملک وسیع و عمر دراز

قصیده بست و نهم (۲۹) در مدح ملکه وکٹوریه انگلستان

آن مور سرکشم که چو مرگش امان دهد | از ننگ پایمال به پرواز جان دهد

راه سخن کشودم اگر خود نشد که بخت | راهم ببزم نوئے گیتی ستان دهد

وکٹوریه که کاتب قسمت ز دفترش | توقیع خسروی بجهان خسروان دهد

آن خواهم از خدائے تو تا که روزگار | از من پذیرد آنچه مرا بر زبان دهد

آن باد کاین شهنشه فرخ تبار را | از شرق تا بغرب کران تا کران دهد

آن باد و در خور است که فرماندهی کنم | بر یک دوده که گنگ بهندوستان دهد

آن باد و خوش بود که شهنشاه بحر و بر | انجام خواهش اسد اللہ خان دهد

قصیدہ سی ام (۳۰) در مدح شہنشاہ انگلستان

در روزگار ہا تواند شمار یافت — خود روزگار نچہ دریں روزگار یافت

برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بہ ہر — ہر کس نشاط تازہ ز ہر گونہ کار یافت

فیض سحر بہ غالب پیمانہ کش رسید — ذوق صبوح عابد شب زندہ دار یافت

قصیدہ سی و پنجم (۳۵) در مدح چارلس مٹکاف

یافت آئینۂ بخت تو ز دولت پرداز — ہلہ کلکتہ بدیں حسن خداداد بناز

گل بر افشاں بگریبان چو حریف سرمست — جلوہ گر شو بنظرہا چو عروس طناز

وقت آنست کہ پائیز تو گردد نوروز — وقت آنست کہ انجام تو بالد آغاز

سیرگاہیست در اطراف تو گوئی کشمیر — روستائیست ز اقصائے تو گوئی شیراز

چارلس مٹکاف فرخندہ شمائل کہ بہ ہر — بستر زامن نظارہ ز فردوس طراز

ایں رقمہا کہ فرو ریختہ ام از رگ کلک — باشد آرائش تقریب پئے عرض نیاز

پنج مطلب ز توام ہست دلے صد گونہ امید — خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز

اولیں اینست کہ در باب معاشی کہ مراست — کنی اندیشۂ محکم بہ طریق ایجاز

دوم آں کز اثر عدل تو اے سنجر عہد — غیر بابندہ دریں وجہ نباشد انباز

سوم آنست کہ دیگر نکنم دست طلب — پیش فرماندہِ میوات بدریوزہ دراز

چارم آنست کہ باقی زر چندیں سالہ　　بے نزاع و جدل و جہد بمن گردد باز
پنجم آن کز پس این فتح کہ بنماید روی　　دہیم مژدۂ اکرام و نوید اعزاز
بخشیم تازہ خطابی دیران فزائے　　خلعتی در خور این دولت جاوید طراز
بکہ کوتہ کنم افسانۂ دعوے بہ دعا　　زانکہ در نظم سراین رشتہ درازست دراز

قصیدہ سی و ہفتم (۳۷) در مدح پرنس بہادر

بے می نکند در کفِ من خامہ روائے　　بر دست ہوا آتشِ بے دود کجائے
در مدح سرایم غزل و باک ندارم　　کز ذوق بود این ہمہ آشفتہ نوائے
اے آنکہ کند سایۂ دست تو ہمائے　　مہلت کہ شاہی ز تو خواہم بگدائے

قصیدہ سی و ہشتم (۳۸) در مدح ٹامس ماڈک

ہرچہ در مبدء فیاض بود آن منست　　گل جدا ناشدہ ز شاخ بدامان منست
مستیم عام مدان دانشم سہل مگیر　　ناقۂ شوقم و جبریل حدی خوان منست
جادۂ عرفی و رفتار شفائی دارم　　دہلی و آگرہ شیراز و صفاہان منست
شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب　　اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان منست
لطف یزداں ز غم دہر نگہبان تو باد　　اے کہ لطفت ز غم دہر نگہبان منست

قصیدهٔ چهل و دوم (۴۲) در تهنیت فتح پنجاب

رسیده است بگوشم صدائے فتح اباب — زترکتاز سپه در قلمرو پنجاب
علو حوصلهٔ این جهان ستان بین — که فتح را لصفا صلح کرده اند حساب
کنون که ملک مطیعست و راه بخش خمار — زمن بگو بفروشندگان بادهٔ ناب
شراب تندیٔ هندوستان دماغم سوخت — زشیره خانهٔ کشمیرم آورند شراب

قصیدهٔ چهل نهم (۴۹) در مدح فرزوائے اوده

گر به عنبل کدهٔ روضهٔ رضوان رفتم — هوس زلف تر سلسله جنبان رفتم
نتوان منت حبا ویده گوارا کردن — همچنان تشنه ز سرچشمهٔ حیوان رفتم
حال من نبگر و از عاقبت کارمپرس — عمر خود گشتم و در غصه بپایان رفتم
نارد بود ببازار جهان جنس وفا — رونقے گشتم و از طالع دکان رفتم
نگهم نقب بگنجینهٔ دلها میزد — مژده باد اهل ریا را که ز میدان رفتم
لکهنؤ دام نشاطے سر راهم گسترد — بیخود از ولولهٔ شوق پرافشان رفتم
نازپروردهٔ خلوت گه آزادگیم — کافرم گر بسراپردهٔ سلطان رفتم
من هم از خیل کریمانم و حجت نبود — گر به دریوزه بدرگاه کریمان رفتم
مدحت نائب مهدی ز محبت باشد — شادمانم که به هنجار محبان رفتم

قصیدهٔ پنجاهم (۵۰) در مدح امجد علی شاہِ اودھ

با من کہ تاب نازِ نکویان نداشتم　　بد کر بد کہ جور و جفا کرد روزگار

گفتم بہ عقل کل کہ ندانم برائے من　　حکم دوام حبس چہ سر کرد روزگار

گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نہ　　کاز راگرفت و بازِ رہا کرد روزگار

تو بلبلے ہمیں کہ بدام آمدی ترا　　اندر قفس زبہرِ نوا کرد روزگار

قصیدهٔ پنجاه و ہفتم (۵۷) در مدح وزیر الدولہ والی ٹونک

عید اضحے بسر آغاز زمستان آمد　　وقت آراستن حجرۂ و ایوان آمد

چند چیزست کہ در پیش گہ اہل تمیز　　بہ گرانمائگی آرایش گیہان آمد

آن درخشندہ درفشے کہ بیغمائی عرب　　در زمان عمر از لشکر ایران آمد

آن فروزندہ و فیروزہ و دل افروز نگیں　　کہ روائی دہِ فرمان سلیمان آمد

دیگر آن جام جہاں بیں کہ بروشن روشی　　عالم افروزتر از مہرِ درخشان آمد

دیگر آن تخت سبکسیر کہ از تیز روی　　ہمدم باد چو بوئے گل ریحان آمد

ہفت گنجینۂ پرویز کہ در ہفت اقلیم　　بہ نموداری ہفت اختر تابان آمد

نہم ہر نکتۂ غامض کہ پیمبر فرمود　　فیض ہر آیت رحمت کہ بقرآن آمد

یارب ایں ہا بتو بخشند و بر آں افزایند　　دم آبی کہ ز سر چشمۂ حیوان آمد

قصیدہ پنجاہ و ہشتم (۵۸) در مدح والی الور

چون من گہر فروش تبا شد بہر بساط
چوں من سخن سرائے نخیزد ز ہر دیار

پیرم ولے بہ طبع جوانان گران نیم
غم خوردنم نہفتہ ومے خوردن آشکار

زاں پس کہ گشت گوہر من در جہاں یتیم
زاں پس کہ کشتہ شد پدر من بکارزار

در بے غبارگے شدہ ام حب کر حضور
رنگیں سخن صرازم و دیریں وظیفہ خوار

دارم بگوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال
اکنوں کہ عمر شست و سہ سالست در شمار

کافی بود مشاہدہ شاہ ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

فرزانہ دادر و کرم پیشہ سرورا
دارم دلے ز زخم جفاے فلک فگار

باایں ہمہ ہموم غموم خسرد گدا از
سہلست غم کہ والی ملکی و غمگسار

پاداش جانگدازی من در طریق نظم
دستی بدستگیری من ز آستیں برآر

قصیدہ شستم (۶۰) در مدح مصطفےٰ خاں شیفتہ

زخمہ بر تار رگ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

رازدانِ خوئی دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں میزنم

در خراباتم ندیدستی خراب
بادہ پنداری کہ پنہاں میزنم

خوے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں میزنم

می ستیزم با قضا از دیرباز | خویش را بر تیغ عریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر می کنم | بوسه بر ساطور و پیکاں میزنم
آں ہمائے تیز پروازم که بال | در ہوائے مصطفیٰ خاں میزنم
خوبیٔ خویش بد آموز من ست | دم ز یاری میزنم ہاں میزنم
بنگرد بے آنکه کلک آں را کشد | نقش گر بر صفحهٔ جاں میزنم

قصیدهٔ شصت و یکم (۶۱) در مدح مفتی صدر الدین آزرده

زاں نمی ترسم که گردد قعر دوزخ جائے من | وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من
نامرادم داد ایں افزونیٔ خواہش بہ بر | آب بر من بسته اند آری ز استسقائے من
دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوته کنید | آنکه ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من
صدر دین و دولت و صدر صدور روزگار | میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائے من
خاک کویش خود پسند افتاد در جذب سجود | سجده ز بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

قصیدهٔ شصت و دوم (۶۲) در مدح برادر نسبتی ضیا الدین نیّر

منم خزینهٔ راز و در خزینهٔ راز | ضیائے دین محمد کہیں برادر من
بدین و دانش و دولت یگانهٔ آفاق | به عمر کہتر و از روئے رتبه مہتر من
به نکته شیوهٔ شاگردیٔ من ہمانا ست | صنم بصورت خود می تراشد آزر من

قصیدہ شصت و سوم (۶۳) در مدح مختار الملک بہادر حیدرآباد

در مدح سخن چسان بگویم
شرطست کہ داستان نگویم

گفتم کہ بہ پیشگاہ نواب
بسیار نگوئے ہان نگویم

مختار الملک را درین عصر
جز آصف جم نشان نگویم

پاکیزگیٔ نہاد پاکش
جز در صفت قدسیان نگویم

نازم روش سخن سرائے
از گوہر خود نشان نگویم

والا گہرا سپہر جاہا
اینہا ازرہ گمان نگویم

کس نیست متاع را خریدار
با آنکہ بہا گران نگویم

زان روکہ خردوران گیتی
رنجند چو قدر دان نگویم

ناچار متاع عرضہ دارم
بے رونقی دکان نگویم

تاب سفر دکن ندارم
از ناقہ و ساربان نگویم

قصیدہ شصت و چہارم (۶۴)

از نکوئی نشان سے نے خواہم
خویش را بدگمان سے نے خواہم

آرزو عیب نیست خردہ مگیر
خواہم اما چنان سے نے خواہم

رنج صاحبدلان روا نبود
بتدہ اہل زبان سے نے خواہم

دو شهها را ذگار نپسندم
بارها را گران نمی خواهم

مور را مار گیر نپذیرم
پشه را پیلبان نمی خواهم

بهر خویش از زمانهٔ غدار
راحت جاودان نمی خواهم

آتش اندر نهاد من زده اند
لاله و ارغوان نمی خواهم

گهر افشانم و بها طلبم
سیم و زر رایگان نمی خواهم

با صلیم فتاده کار بدهر
علم کاویان نمی خواهم

در مدح گورنر لارڈ الگن از شش قصیده های مجموعهٔ سبد چین

بیا که مدح خداوند دادگر گویم
ز آنچه گفتم ازین پیش بیشتر گویم

ز شاعری به ندیمی رسیده ام خواهم
که رویداد به پیرایهٔ سمر گویم

رعایت ادب آیین من بود ناچار
فسانه گرچه دراز است مختصر گویم

سخن نهال نو و کهنه باغبان غالب
نهال را به نوی مژدهٔ ثمر گویم

طریق وادی غم را کسی نبوده رفیق
خود از صعوبت این ره خبر گویم

در آن دیار که گوهر خریدن آیین نیست
دکان گشوده ام و قیمت گهر گویم

ز عز و جاه نیاکان خویش در سرکار
هزار گونه حکایات معتبر گویم

دعای دولت شاه و وزیر همواره
ز نیم شب کنم آغاز و تا سحر گویم

غزلیات

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا — باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا

آب نہ بخشی بہ زور خونِ سکندر ہدر — جان نہ پذیری بہ ہیچ نقدِ خضر نارَوا

بزم ترا شمع و گل خستگئ بوتراب — سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

خاموشی ما گشت بد آموز بتان را — زیں پیش وگرنہ اثری بود فغان را

بر طاعتیان فرّخ و بر عشرتیان سہل — نازم شبِ آدینۂ ماہ رمضان را

عیش و غم در دل نمی اِستد خوشا آزادگی — بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوی — سایہ ہمچون دود بالا میرود از بالِ ما

جان غالب تابِ گفتاری گمانداری ہنوز — سخت بیدردی کہ می پرسی ز ما احوالِ ما

گر بیائی مست ناگاہ از در گلزار ما — گل ز بالیدن رسد تا گوشۂ دستار ما

سخت جانیم و قماش خاطر ما نازکست — کارگاہِ شیشہ پندارے بُود کہسارِ ما

غالب از صهبای اخلاق ظهوری سرخوشیم — پارهٔ بیش است از گفتار ما کردار ما

ازین بیگانگیهای تراود آشنائیها — حیای در زدو در پرده رسوائی کند ما را
حذر از زمهریر سینهٔ آسودگان غالب — چه منتها کز بر دل نیست جان ناشکیبا را

محو کن نقش دوئی از ورق سینهٔ ما — ای نگاهت الف صیقل آئینهٔ ما
غالب امشب همه از دیده چکیدن دارد — خون دل بود مگر بادهٔ دوشینهٔ ما

جوئی از باده و جوئی ز عسل دارد خلد — لب لعل تو هم اینست و هم آنست مرا
خارها ز اثر گرمی رفتارم سوخت — منتی بر قدم راهرو انست مرا
رهرو تفتهٔ در رفته به تیمم غالب — تشنه بر لب جو مانده نشانست مرا

آشنایانه کشد خار رهت دامن ما — گوئی این بود ز پس پیش به پیرهن ما
بی تو چون باده که در شیشه هم از شیشه جداست — نبُد آمیزش جان در تن ما با تن ما
سخن ما ز لطافت نپذیرد تحریر — نشود گرد نمایان ز رم توسن ما
طوطیان را نبود هرزه جگر گون منقار — خورده خون جگر از رشک سخن گفتن ما
ما نبودیم بدین مرتبه راضی غالب — شعر خود خواهش آن کرد که گردد فن ما

نقشی ز خود براه گزر بسته ایم ما — بر دوست راه ذوق نظر بسته ایم ما

یا بندهٔ خود این همه سختی نے کنند — خود را بزور بر تو مگر بسته ایم ما

در گرد غربت آئینه دار خودیم ما — یعنی ز بیکسان دیار خودیم ما

دیگر ز ساز بیخودیٔ ما صدا مجوی — آوازی از گسستن تار خودیم ما

از بسکه خاطر هوس گل عزیز بود — خون گشته ایم و باغ و بهار خودیم ما

هر کس خبر ز حوصلهٔ خویش میدهد — بد مستی حریف و خمار خودیم ما

غالب چو شخص و عکس در آئینهٔ خیال — با خویشتن یکی و دو چار خودیم ما

به شغل انتظار مهوشان در خلوت شبها — سر تار نظر شد رشتهٔ تسبیح کوکبها

خوشا رندی و خوش زنده رود مشرب عذبش — به لب خشکی چه میری در سرابستان مذهبها

پس از عمری که فرسودم به مشق پارسائیها — گرا گفت و من تن در ندادم از خود نمائیها

چه نازش باشد دو شاهد را به بحث ناز بخشیدن — نگه در نکته زائیها نفس در سر رسائیها

سخن کوته مرا هم دل به تقوی مائلست اما — ز ننگ زاهد افتادم بکافر ماجرائیها

ز نخم گر بصورت از گدایان بوده ام غالب — بدار الملک معنی می کنم فرمان روائیها

من آن نیم که دگر می‌توان فریفت مرا — فریبمش که مگر می‌توان فریفت مرا
شب فراق ندارد سحر ولے یکچند — بہ گفتگوے سحر می‌توان فریفت مرا
سرشت من بود این ورنہ آن نیم غالب — کہ از وفا بہ اثر می‌توان فریفت مرا

ز من گرت نبود باور انتظار بیا — بہانہ جوی مباش و ستیزہ کار بیا
ہلاک شیوۂ تمکین مخواہ مستان را — عنان گسستہ تر از باد نوبہار بیا
ز ما گسستی و با دیگران گرو بستے — بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
ز خوے تست نہاد شکیب نازک تر — بیا کہ دست و دلم میرود ز کار بیا
حصار عافیتی گر ہوس کنی غالب — چو ما بہ حلقۂ رندان خاکسار بیا

چون بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکیٔ روزم نہان — کو چراغی تا بجویم شام را
آن میم باید کہ چون ریزم بجام — زور مے در گردش آرد جام را
تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود — خوش بود گر دانہ نبود دام را
رحمت عام ست دائم خاص را — عشرتی خاص ست ہر دم عام را
دلستان در خشم غالب بوسہ جوے — شوق نشناسد ہمے ہنگام را

بر نمی آید ز چشم از جوشش حیرانی مرا　　شد نگہ زنار تسبیح سلیمانی مرا
وہ کہ پیش از من بپابوس کسی خواہد رسید　　سجدۂ شوقی کہ می بالد بہ پیشانی مرا
بر نیایم با روانیہائے طبعِ خویشتن　　موجِ آب گوہر من کردہ طوفانی مرا
خویش را چون موج گوہر گرچہ گرد آوردہ ام　　دل پُرست از ذوق انداز پرافشانی مرا
تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جان دہم　　گر بموج افتد گمانِ چین پیشانی مرا

از وہم قطرہ گیست کہ در خود گمیم ما　　اما چو وارسیم ہمان قلزمیم ما
مردم بہ کیسہ تشنۂ خون ہند و بس　　خون می خوریم چون ہم ازین مردمیم ما
پنہان بہ عالمیم ز بس عینِ عالمیم　　چون قطرہ در روانیٔ دریا گمیم ما

نشستن بر سر راہ تحیّر عالمے دردد　　کہ ہر کس میرود از خویش میگردد دو چار ما
فروزد ہر قدر رنگِ گل افزاید تب و تابش　　کباب آتش خویش ست پنداری بہار ما

بسا یانِ محبت یادی آرم زمانی را　　کہ دل عہد وفا نابستہ دادم دلستانی را

خوش وقتِ اسیری کہ بر آمد ہوس ما　　شد روز نخستین سبدِ گل قفس ما

در دہر فرو رفتۂ لذت نتوان بود — بر قند نہ بر شہد نشیند مگس ما
باشد کہ بدین سایہ دو ہر چشمہ گرایند — یاران عزیز اند گروہی ز پس ما
خرسندی غالب بنود زین ہمہ گفتن — یکبار بفرمائے گدائے ہیچکس ما

ز پیکانہائی ناوک در دلِ گرمم نشان بنود — بریگستان چہ جوئی قطرہ ہائے آب باران را
کف خاکیم از ما بر نخیزد جز غبار آنجا — نزول از صرصری نبود قیامت خاکساران را
نگشت از سجدۂ حق جبہۂ زہاد نورانی — چنان کافروخت تاب بادہ روئے بادہ خواران را
دریغ آگاہیے کافسردگی گردد سر و برگش — ز مستی بہرہ جز غفلت نباشد ہوشیاران را

چمن طراز جنونیم دشت و کوہ از ماست — بہ مُہرِ داغِ شقائق بود قبالۂ ما
ہمیں گداختن است آبروئے ما غالب — گہرچہ ناز فروشد بہ پیش ژالۂ ما

چو غنچہ جوشش صفای تنش ز بالیدن — دریدہ بر تنِ نازک قبائے تنگش را
ز ظرف غالب آشفتہ گر نہ آگاہ — بیا ز ما بہ مئی تند ہوش و ہنگش را

راز خویت از بد آموز تو میجوئیم ما — از تو می گوئیم گر با غیر می گوئیم ما
راز عاشق از شکست رنگ رسوا می شود — با وجودِ سخت جانیہا تنک روئیم ما

زحمتِ احباب نتوان داد غالب بیش ازین هرچه مے گوئیم بہر خویش مے گوئیم ما

شوخی کہ خود ز نام وفا ننگ داشتی
بر باد میدہد بوفا نام و ننگ را

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوی اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

ندارم شکوہ از غم با ہجوم شوق خرسندم ز جا برداشت جوش دل بہانہ داغِ ہجران را
تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنارستم ز راہم باز چین دام نوازشہای پنہان را

بخلوت مژدۂ نزدیکی یارست پہلو را فریب امتحان پاکبازی دادہ ام ورا
جہان از بادہ و شاہد بدان ماند کہ پنداری بدنیا از پس آدم فرستادند مینو را
نباشد دیدہ تا حق بین مدہ دستوری نگرش چو گوہر سنج کو پیش از گہر سنجد ترازو را

حسرت وصل از چہ زد چون بخیال سرخوشیم ابر اگر بایستد بر لب جوست کشتِ ما
بادہ اگر بود حرام بذلہ خلافِ شرع نیست دل نہ نہی بخوب ما طعنہ مزن بزشت ما

آید بچشم روشنیٔ ذرہ آفتاب — بر ہر زمین کہ طرح کنی نقشِ پائے را
حُسن بُتان ز جلوۂ ناز تو رنگ داشت — بیخود بہ بوئے بادہ کشیدیم لائے را
مُردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم — یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

با اضطرابِ دل ز رہِ اندیشہ فارغم
آسایشیست جنبشِ این گاہوارہ را

قضا آئینہ دارِ عجز خواہد نازِ شاہی را — شکستے در نہادِ ستی ادائے کجکلاہی را
طبیعی نیست ہر جا اختلاط از وے حذر خوشتر — کم از سوزندہ آتش نیست آبِ گرم ماہی را
شبم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا — ہلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہی را

چشم بر تازگیِ شورِ جنون دوختہ ست — در خزان بیش بود مستیِ دیوانۂ ما
مُی باندازہ حرام آمدہ ساقی برخیز — شیشۂ خود بشکن بر سرِ پیمانۂ ما

قضا در کارہا اندازۂ ہر کس نگہدارد — بقطعِ وادیٔ غم می گمارد تیزگامان را
بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در طاعت — تو دانی تا بہ لُطف از خاک برداری گدایان را

جهان رقاصی دعاییست آن مغرور واین عاجز بیا غالب ز خاصان بگذر و بگذار عامان را

نگویم تازه دارم شیوهٔ جادو بیانان را دلی در خویش بینم کارگر جادوئے آنان را
مرنج از ناروائی بے نیازی عالمی دارد حکایتها بوَد با خویشتن مربے زبانان را
ند، ند قدر غم تا در نماند کس بدان غالب سترت خیزد از تقلید پیران نوجوانان را

خیز و بیراهه روی راسررای دریاب شورش افزا نگهِ حوصله گاهی دریاب
عالم آئینهٔ رازست چه پیدا چه نهان تابِ اندیشه نداری به نگاهی دریاب
گر به معنی نرسی جلوهٔ صورت چه کمست خم زلف و شکنِ طرفِ کلاهی دریاب
فرصت از کف مده و وقت غنیمت پندار نیست گر صبح بهاری شبِ ماهی دریاب
غالب و کشمکش بیم و امیدش هیهات یا به تیغی بکُشش و یا به نگاهی دریاب

شیوه ها در دو من معتقد خوئے ویم شوقم از رنجش او گر بفزاید چه عجب
چون کشد می کُشدم رشک که در پردهٔ جام از لبِ خویش اگر بوسه رباید چه عجب
طرهٔ درهم و پیراهنِ چاکش نگرید اگر از ناز بخود هم نگراید چه عجب
کار با مطربهٔ زُهره نهادی دارم گر لبم ناله به هنجار سراید چه عجب
آنکه چون برق بیکجا نگیرد آرام گله اش در دل اگر دیر نپاید چه عجب

بذوقِ وعده سامانِ نشاطی کرده‌ام پندارم
ز فرشِ گل بروی آتشم بنشانده است امشب

نخواهم میرسد بندِ قبا واکرده از مستی
ندانم شوقِ من بروی چه افسون خوانده است امشب

نوشت افسانهٔ دردِ جدائی مختصر غالب
بمحشر میتوان گفت آنچه در دل مانده است امشب

از اندهِ نایافت تسلّی میکنم امشب
گر پردهٔ هستیت که شق میکنم امشب

هان آئینه بگزار که عکسم نفریبد
نظارهٔ یکتائیِ حق میکنم امشب

جان برلبم اندازهٔ دریاکشیم نیست
از می طلبِ سدِّ رمق میکنم امشب

نازم سخنش را و نیابم دهنش را
خوش تفرقه در باطل و حق میکنم امشب

غالب نبود شیوهٔ من قافیه بندی
ظلمیست که بر کلک و ورق میکنم امشب

سحر دمیده و گل در دمیدنست مخسپ
جهان جهان گلِ نظاره چیدنست مخسپ

مشام را به شمیم گلے نوازش کن
نسیم غالیه سا در وزیدنست مخسپ

ستارهٔ سحری مژده سنجِ دیداریست
ببین که چشمهٔ فلک در پریدنست مخسپ

تو محوِ خواب و سحر در تأسف از انجم
به پشت دست بدندان گزیدنست مخسپ

نفس ز ناله به سنبل درودنست مخیز
ز خون دل مژه در لاله چیدنست مخسپ

نشانِ زندگیِ دل دویدنست مایست
جلائے آئینهٔ چشم دیدنست مخسپ

ز دیده سودِ حریفان کشودنست مَبَند — ز دل مرادِ عزیزان تپیدنست مخسپ
بذکرِ مرگ شبی زنده داشتن ذوقیست — گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ

گلشن بفضائے چمنِ سینۂ ما نیست — هر دل که نه زخمی خورد از تیغ تو وا نیست
میسوزم و می ترسم از آسیب زدانش — آوخ که در آتش اثرِ آبِ بقا نیست
عمری سپری گشت و هماں بر سرِ جورست — گویند بتان رکه وفا نیست چرا نیست
جنّت نکند چارۂ افسردگیِ دل — تعمیر باندازۂ ویرانئے ما نیست
هر مرحله از دهر سرابست لبی را — کز نقشِ کفِ پائے کسی بوسه ربا نیست
از ناز دلِ بے هوسِ ما نه پسندید — دل تنگ شد و گفت درین خانه هوا نیست
دریوزۂ راحت نتوان کرد ز مرهم — غالب همه تن خستۂ یارست گدا نیست

عکسِ تعش را در آب لرزه بود هم ز موج — بیم نگاهِ خودش کارگر افتاده است
آن همه آزادگی وین همه دلدادگی — حیف که غالب ز خویش بیخبر افتاده است

حُسنِ تو در حجاب ز شرمِ گناهِ کیست — جا بر کرشمه تنگ ز جوشِ نگاهِ کیست
ما با تو آشنا و تو بیگانه ز ما — آخر تو و خدا که جهانی گواه کیست
رشک آیدم بر دشنی دیده هائے خلق — دانسته ام که از تهِ گردِ راهِ کیست

بیخود بوقت ذبح تپیدن گناہ من — دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

یاد از عدو نیارم و ین ہم ز دوربینیست — کاندر دلم گزشتن با دوست ہمنشینیست
در عالم خرابی از خیل منعمانم — سیلم برخت شوئی برقم بخوشہ چینیست
سوزم دمی کہ یارم یاد آورد کہ غالب — در خاطرش گزشتن با غیر ہمنشینیست

ناز سرمایۂ دیگر ز تو یافت — نمکِ خوانِ تو خوانِ نمکست
نطق من مایۂ من بس غالب — خود نمک گوہرِ کانِ نمکست

مگر ز پارۂ سنگم کہ ریزدت دمِ تیغ — بکش مترس کہ در سودِ من زیانِ تو نیست
دلم بعہدِ وفائی فریفت نامہ سپار — خوش ست وعدۂ تو گرچہ از زبانِ تو نیست
روان فدائی تو نام کہ بردہ نا صبح — زہی لطافت ذوقیکہ در بیانِ تو نیست
گمان زیست بود بر منت ز بیدردی — بدست مرگ ولی بدتر از گمانِ تو نیست

ایکہ گفتی غم درون سینہ جانفرساست ہست — خامشیم اما اگر دانی کہ حق باماست ہست
این سخن حق بود وگاہی بر زبانِ ما نرفت — چون تو خود گفتی کہ خوبا ز دل ازفاست ہست
ہم وفا ہم خواہشِ ایچ پرسشِ عیب نیست — آنکہ میگفتی کہ خواہش در وفا بیجاست ہست

سینه بکشودیم و خلقی دید کاینجا آتش است / بعد ازین گویند آتش را که گویا آتش است
انتظار جلوهٔ ساقی کبابم میکند / می بساغر آب حیوان و به مینا آتش است
بی تکلف در بلا بودن به از بیم بلاست / قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش است
پاک خور امروز و زنهار از پی فردا مده / در شریعت باده امروز آب و فردا آتش است
گشته ام غالب طرف با مشرب عرفی که گفت / روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

بیا که فصل بهارست و گل به صحن چمن / گشاده روی تر از شاهدان بازارست
ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست / بگرد نقطهٔ ما دور هفت پرکارست

سموم وادی امکان ز بس جگر تابست / گداز زهرهٔ خاکست هر کجا آبست
مرنج از شب تار و بیا به بزم نشاط / که پنبهٔ سر مینای باده مهتابست
ز و شمع روزن دیوار میتوان دانست / که چشم غمکدهٔ ما براه سیلابست
قوی فتاده چو نسبت ادب مجو غالب / ندیدهٔ که سوی قبله پشت محرابست

نازم نگه شرم که دلها ز میان برد / ز انسان که خود آن چشم فسون ساز ندانست
مخمور مکافات به خلد و سقر آویخت / مشتاق عطا شعله ز گل باز ندانست

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست
گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

ناچار با تغافل صیاد ساختم
پنداشتم کہ حلقۂ دام آشیانہ ایست

پابستۂ نورد خیالی چو وارسے
ہر عالمے ز عالم دیگر فسانہ ایست

در پردۂ تو چند کشم ناز عالمے
داغم ز روزگار و فراقت بہانہ ایست

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست
ظرف فقیہ می نجست بادۂ ما گزک نخواست

غرقہ بموجہ تاب خورد تشنہ ز دجلہ آب خورد
زحمت ہیچیک نداد راحت ہیچ یک نخواست

جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

زاہد و ورزش سجود آہ ز دعوی وجود
تا نزد اہرمن رہش بدرقۂ ملک نخواست

بحث و جدل بجے مان میکدہ جوے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

خرقہ خورش ست در برم پردہ چنین خشن خوش ست
عشق بخار خار غم پیرہنم تنک نخواست

زند ہزار شیوہ را طاعت حق گران نبود
لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

سہل شمرد و سرسری تا تو ز عجز نشمرے
غالب اگر بدوری داد خود از فلک نخواست

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر
آہستہ پا نہم کہ سر خار نازک ست

از جنبش نسیم فرو ریزدی ز ہم
مانا چو برگ گل در و دیوار نازک ست

میرنجد از تحمّل ما بر جفائے خویش — ہان شکوۂ کہ خاطرِ دلدار نازک ست

تا در آب افتادہ عکسِ قدِ دلجوئیش — چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانیہاست
کشتۂ دلِ خویشم کز ستمگران یکسر — دید دلفریبی ہا گفت مہربانیہاست
ایکہ اندرین وادی مژدہ از ہما دادی — بر سرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست
ذوقِ فکرِ غالب را بردہ ز انجمن بیرون — با ظہوری و صائب محوِ ہم زبانیہاست

سرگرمیِ خیالِ تو از نالہ باز داشت — دل پارہ آتشیست کہ دودش نماندہ است
داد از تغافلے کہ بگوشت نمیرسد — آہ از توقعی کہ وجودش نماندہ است
دِل را بوعدۂ ستمی میتوان فریفت — نازی کہ بر وفائے تو بودش نماندہ است
دل جلوہ میدہد ہنرِ خود در انجمن — رحمی مگر بجانِ حسودش نماندہ است
غالب زبان بریدہ و آگندہ گوش نیست — امّا دماغِ گفت و شنودش نماندہ است

بیخود بزیرِ سایۂ طوبےٰ غنودہ اند — شبگیرِ رہروان تمنّا بلند نیست
غالب من و خدا کہ سر انجامِ برشگال — غیر از شراب و انبہ و برفاب و قند نیست

منع ما از بادہ عرضِ احتسابی بیش نیست — محتسب افشردۂ انگور آبی بیش نیست

خارج از ہنگامہ سرتا سر بہ بیکاری گزشت — رشتۂ عمرِ خضر مدِّ حسابی بیش نیست

قطرہ و موج و کف و گرداب جیحون است و بس — این من و مائی کہ می بالد حبابی بیش نیست

خویش را صورت پرستان ہرزہ رسوا کردہ اند — جلوہ می نامند و در معنی نقابی بیش نیست

نامہ بر از پیشگاہِ نازِ مکتوبِ مرا — پاسخی آوردہ ست امّا جوابی بیش نیست

جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم — حسن با این تابناکی آفتابی بیش نیست

چند رنگین نکتۂ دلکش تکلف برطرف — دیدہ ام دیوانِ غالب انتخابی بیش نیست

شہرۂ دل نیست گر حسرت مرا اینجا از چہ رد — چشمِ اہلِ دل زبان دانِ نگاہِ سائلست

باہمہ نزدیکی از وی کام دل نتوان گرفت — تشنۂ ما بر کنارِ آب جو پا در گلست

عقل در اثبات وحدت خیرہ میگردد چرا — ہر چہ جز ہستیست ہیچ و ہر چہ جز حق باطلست

ما ہمان عین خودیم امّا خود از وہمِ دوئی — در میانِ ما و غالب ما و غالب حائلست

در مژدہ ز جوئے عسل و کاخ زمرّد — چیزے کہ بہ دل بستگی ارزد مے نابست

ہم چشمئ آئینہ مگند از نظر ما — ما را کہ ز بیداریِ دل دیدہ بخوابست

خیز و در دامن بادِ سحر آویز بہ عذر — گر شبت تیرہ بداغ مژہ بکشودن رفت

بر تنک مایگیم رحم کہ یک عمر گناہ — ہم بتاراجِ سبکدستیِ بخشودن رفت

شست و شو مشغلۂ شوخیِ ابر کرمست | وزم آن خرقہ کہ با داغ نیالودن رفت
مدعی خواست ردو بر اثرِ من غالبؔ | ہر چہ زد بود بسودائے چو من بودن رفت

زہے لطافتِ پرواز سعیٔ ابر بہار | کہ ہر چہ در دلِ باد ست از زمین پیداست
عیار فطرتِ پیشینیان زما خیزد | صفائے بادہ ازین دُردِ تہ نشین پیداست
زہے شکوہ تو کاندر طراز صورت تو | زخود برآمدنِ صورت آفرین پیداست
نہادِ نرم زشیرینیِ سخن غالبؔ | بسانِ موم زاجزائے انگبین پیداست

ہر گونہ حسرتی کہ ز ایام می کشیم | دُردِ تہِ پیالۂ اُمّید بودہ است
حق راز خلق جو کہ نو آموزِ دید را | آئینہ خانہ مکتبِ توحید بودہ است

یار در عہد شبابم بکنار آمد و رفت | ہمچو عیدی کہ در ایّام بہار آمد و رفت
شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگراند | روزِ روشن بوداعِ شبِ تار آمد و رفت
ہرزہ مشتاب و پیٔ جادہ شناسان بردار | اے کہ در راہِ سخن چون تو ہزار آمد و رفت
ہلہ غافل ز بہاران چہ طمع داشتۂ | گیر کامسال بر نگینیٔ پار آمد و رفت

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ ست | جرعہ را دین عوض آرید می ارزان شدہ است

در دلش جوئی و در دیر و حرم نشناسی — تا چه رُوداد که در زاویه پنهان شده است

فغان که برقِ عتابِ تو آن چنانم سوخت — که راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت
شنیده‌ئی که بآتش نسوخت ابراهیم — ببین که بے شرر و شعله میتوانم سوخت
مرادِ میدنِ گُل در گمان نگنجد امروز — که باز بر سرِ شاخِ گُل آشیانم سوخت
نفس گداختگی ہائے شوق را نازم — چه شمع ہا که سراپردهٔ بیانم سوخت
نویدِ آمدنت رشک از قفا دارد — شگفته روئیِ گلہائے بوستانم سوخت
کسی درین کفِ خاکسترم مباد انباز — چه شد گر آتشِ ہمسایه خانمانم سوخت
سخن چه عطرِ شرر بر دماغ زد غالب — که تابِ عطسۂ اندیشه مغز جانم سوخت

گفتم بروزگار سخنور چو من بسیست — گفتند اندرین که تو گفتی سخن بسیست
معنی غریبِ مدعی و خانه زادِ ماست — ہر جا عقیق نادر و اندر یمن بسیست
در صفحه نبودم ہمه آنچه در دلست — در بزم کمتر ست گل و در چمن بسیست

به رنج از پئے راحت نگاه داشته اند — ز حکمتست که پای شکسته در بندست
ز گفته‌ئی که به تلخے بساز و پند پذیر — برو که بادۂ ما تلخ تر ازین پندست
نه آن بود که وفا خواہد از جہان غالب — بدین که پرسد و گوید ہست خرسندست

شه به گدا کجا رسد زانکه چو فتنه روی داد   خاتم دست دیو برد کشور دل پری گرفت
ای که دلت ز غصه سوخت شکوه نه در خور دناست   در نگر آنکه سرکشی گیر که سرسری گرفت

نازم بفریبی که دهی اهل نظر را   کز بوسه پیامی بدهانست و دهان نیست
سرمایهٔ هر قطره که گم گشت به دریا   سودیست که مانا بزیانست وزیان نیست
در هر مژه بر هم زدن این خلق جدیدست   نظاره سگالد که همانست و همان نیست
در شاخ بود موج گل از جوشش بهاران   چون باده به مینا که نهانست و نهان نیست
ناکس ز تنومندی ظاهر نشود کس   چون سنگ سره که گرانست و گران نیست
پهلو بشگافید و ببینید دلم را   تا چند بگوییم که چسانست و چسان نیست
غالب بله نظارگی خویش توان بود   زین پرده برون آنکه چنانست و چنان نیست

دل برد و حق آنست که دلبر نتوان گفت   بیداد توان دید و ستمگر نتوان گفت
پیوسته دهد باده و ساقی نتوان خواند   همواره تراشد بت و آزر نتوان گفت
در گرم روی سایه و سرچشمه نجوییم   با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتوان گفت
آن راز که در سینه نهانست نه وعظست   بر دار توان گفت و به منبر نتوان گفت
کاری عجب افتاد بدین شیفته مارا   مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت

مشاطه به آرایش آن حسن خداداد
گل در چمن و قند به بنگاله فرو ریخت
در قالب ما اثرش پرده کشا شد
خاکی که قضا در تن گوساله فرو ریخت
دزدیده سراپای سخن از بیم تو غالب
گویی رگ ابر قلمت ژاله فرو ریخت

گل فراوان بود و می پر زور دوشم بر بساط
خود بخود پیمانه میگردید و گردیدن نداشت
برد آدم از امانت هر چه گردون برنتافت
ریخت می بر خاک چون در جام گنجیدن نداشت

ببین که در گل و مل جلوه گری تو کیست
بپوش دیده ز حق طالب رضای تو کیست
کلید بستگی است غم بجوشش ای دل
تو گر چنین نگدازی گره کشای تو کیست
بلا به صورت زلف تو رو نما آید
به بند خصمی دهریم مبتلای تو کیست
فرشته معنی متن تنبک نمی فهمم
بمن بگوی که غالب بگو خدای تو کیست

به وادیی که در آن خضر را عصا خفتست
بسینه می سپرم ره اگر چه پا خفتست
هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسسته لنگر کشتی و ناخدا خفتست
دمم به سبحه و سجاده و ردا لرزد
که دزد در مرحله بیدار و پارسا خفتست
درازی شب و بیداری من اینهمه نیست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

دگر ز ایمنیِ راه و قربِ کعبه چه حظ   مرا که ناقه ز رفتار ماند و پا خفتست

مستیِ اندازِ لغزشی دارد   حیف پایی که آفتش ز سرست
عقل و دین بردهٔ دل و جان نیز   آنچه از ما نبردهٔ خبرست
شه حریر و گدا پلاس برید   آنچه من قطع کرده‌ام نظرست
قفس و دام رایگانی نیست   ریختن در نهادِ بال و پرست
ریزد آن برگ و این گل افشاند   هم خزان هم بهار در گذرست
کم خود گیر و بیش شو غالب   قطره ز ترکِ خویشتن گهرست

نه بد جسته شرار و نه بجا مانده رماد   سوختم لیک ندانم به چه عنوانم سوخت
پایم از گرمیِ رفتار نمی‌سوخت براه   در قدم سوختنِ خارِ بیابانم سوخت
دیگر از خاتمهٔ کفر چه گویم غالب   من که رخشندگیِ جوهرِ ایمانم سوخت

در بذلِ لآلی دو رقم دستِ کریم ست   نی نی نی کلکم رگِ مژگانِ یتیم ست
بختم ندهد کامِ دلِ غمزده غالب   گویی لبِ یارست که در بوسه لئیم ست

ستم زخون دل که دو چشمم ازان پر است — گوئی مخور شراب و نه بینی بجام چیست

با دوست هر که باده بخلوت خورد مدام — داند که حور و کوثر و دارالسلام چیست

دلخسته غمیم و نبود مے دوائی ما — با خستگان حدیث حلال و حرام چیست

در روز تیره از شب تارم نماند بیم — چون صبح نیست خود چه شناسم که شام چیست

از کاسهٔ کرام نصیب ست خاک را — تا از فلک نصیبهٔ کاس کرام چیست

نیکی ز تست از تو نخواهیم مزد کار — ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

غالب اگر نه خرقه و مصحف بهم فروخت — پرسد چرا که نرخ مے لاله فام چیست

چون اصل کار در نظر همنشین نبود — بیچاره خرده بر روش جستجو گرفت

لطف خدای ذوق نشاطش نمیدهد — کافر دلی که با ستم دوست خو گرفت

شرمندهٔ نوازش گردون نمانده ام — گر چاک دوخت جامه بمزد رفو گرفت

از یک سبوست باده و قسمت جدا جداست — جمشید جام برد و قلندر کدو گرفت

فرمان روا نگشت سلیمان بهیچ عصر — گر رفت مرغ زمین ده ثریا فرو گرفت

رضوان چو شهد و شیر به غالب حواله کرد — بیچاره باز داد و مے مشک بو گرفت

ز سردی نفس نامه بر توان دانست — که نارسیده پیام مرا جوابی هست

ز سردمهری ایام نیستیم نژند — که در خرابهٔ ما روی آفتابی هست
بهار هند بود برشگال هان غالب — درین خزان کده هم موسم شرابی هست

حریفِ ما همه بی بذله می خورد غالب — مگر ز خلوتِ واعظ به محفل افتادست

ما و خاک رهگذر بر فرقِ عریان ریختن — گل کسی جوید که او را گوشهٔ دستار هست
ور پرستش سستم و در کامجوئی استوار — پادشه را بندهٔ کم خدمت پرخوار هست
راز دیدنها مجوی و از شنیدنها مگوی — نقشها در خامه و آهنگها در تار هست
کهنه نخلی تازه ز صرصر ز پا افتاده ام — خاکم ار کاوی هنوزم ریشه در گلزار هست

ای که خوی تو همچو روی تو نیست — دیده از دل امیدوار ترست
خسته از راه دور می آییم — پا ز تن پاره فگار ترست

رموز دین نشناسم درست و معذورم — نهادِ من عجمی و طریقِ من عربیست
نشاطِ جم طلب از آسمان نه شوکتِ جم — قدح مباش ز یاقوت باده گر عنبیست
بالتفات نیرزم در آرزو چه نزاع — نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبیست

نه هم پیالگی زاهدان بلاست بود ‌ ‌ ‌ خوش است گرمی عیش خلاف شرع نیست
هرانچه در نگری جز به جنس مائل نیست ‌ ‌ ‌ عیار بیکسی ما شرافت نسبیست
میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی ‌ ‌ ‌ بیا بیا که هیجان قوت غضبیست

بجام و آینه حرف جم و سکندر چیست ‌ ‌ ‌ که هرچه رفت بهر عهد در زمانهٔ تست
هم از احاطهٔ تست اینکه در جهان ما ‌ ‌ ‌ قدم به بتکده و سر بر آستانهٔ تست
سپهر را تو بتاراج ما گماشته ‌ ‌ ‌ نه هرچه دزد زما برد در خزانهٔ تست
مرا چه جرم گر اندیشه آسمان پیماست ‌ ‌ ‌ نه تیزگامی توسن ز تازیانهٔ تست
ترا که محو سخن گستران پیشینی ‌ ‌ ‌ مباش منکر غالب که در زمانهٔ تست

محو خود است یاک چون من درین چه بحث ‌ ‌ ‌ او چون خودی نداشته دشمن درین چه بحث
افسانه گوست غیر چه مهر افگنی برو ‌ ‌ ‌ غم بر نتابد این همه گفتن درین چه بحث
بت را بجلوه دیده و برجای مانده است ‌ ‌ ‌ گر بحث می کنم به برهمن درین چه بحث
بعد از خزان که رحمت حق بر روانش باد ‌ ‌ ‌ ما کرده ایم پرورش فن درین چه بحث
او جسته جسته غالب و من دسته دسته ام ‌ ‌ ‌ عرفی کسیست لیک نه چون من درین چه بحث

نقشم گرفتہ دوست نمودن چہ احتیاج — آئینۂ مرا بزدودن چہ احتیاج
با پیرہن زناز فرو می رود بہ دل — بند قبائے دوست کشودن چہ احتیاج
در دست دیگریست سفید و سیاہ ما — با روز و شب بعربدہ بودن چہ احتیاج
آن کن کہ در نگاہ کسان محتشم شوی — بر خویش ہم زخویش فزودن چہ احتیاج

جلوہ میخواہیم آتش شو ہولائے ما مسنج — دستگاہ خویش بیں و مدعائے ما مسنج
در گزر زیں پردہ چوں دمساز غالب نیستی — مدعی ہنجار خود گیر و تولائے ما مسنج

در پردہ شکایت زتو داریم و بیان ہیچ — زخم دل ما جملہ دہانست و زبان ہیچ
تن پروری خلق فزودن شد ز ریاضت — جز گرمی افطار ندارد رمضان ہیچ
پیمانۂ رنگیست دریں بزم بگردش — ہستی ہمہ طوفان بہارست خزان ہیچ
عالم ہمہ مرآت وجودست عدم چیست — تا کار کند چشم محیط است و کران ہیچ
غالب زگرفتاری اوہام بروں آی — باللہ جہاں ہیچ و بد و نیک جہاں ہیچ

اے ہوس کارت زگستاخی بہ بیرحمی کشید — نازکیہائے میانش بیں بہ بالیش مپیچ
بیش ازیں کی بود انہم اتفاقی بودہ است — اینقدر بر خود ز رنجشہائے بیجایش مپیچ

آفاق بهم دشمن و همدرد لب شمع   ما پاک سرشتیم و تو داغ دم صبح
پیش ازیں باد بهار ایں همه سرمست نبود   شبنم ماست که تر کرده دماغ دم صبح
حق آن گرمی هنگامه که دارم بشناس   اے که در بزم تو مانم بچراغ دم صبح
غالب امروز بوقتی که صبوحی زده ام   چیده ام ایں گل اندیشه زباغ دم صبح

در فصل دی گذشته جهان ز مهر رازد   بنشین که آب گردش ساغر کنیم طرح
تا چند نشنوی تو و ما حسب حال خویش   افسانه هائے غیر مکرر کنیم طرح
آئین برهمن بنهایت رسانده ایم   غالب بیا که شیوهٔ آذر کنیم طرح

خواهش وصل خود ز غیر ز اخلاص سنج   کاین گدائیست بدریوزه دربها گستاخ
شد دگر دم که بخلوت زبیدست رقیب   بینمش چون بتو در راه گذر با گستاخ
تا ز دلهائے نوازشش چه محابا باشد   سر زلفی که به پیچید بکمرها گستاخ

کفیل هوش خودم وقت می ببزم حبیب   بشرط آنکه زیک قلزمم فزون ندهد
شریک کار نیاورد تاب سختی کار   جواب نامهٔ ما غیر بے ستون ندهد
بمن گرائے و وفا جو که ساده برهمنم   بسنگ هر که دهد دل بغمزه جان ندهد

بروی عقدهٔ کارم بہ شکلِ برگ خزان — ز لرزهٔ ناخنِ دستِ گره کشا ریزد
شباب دزد چہ ناقدردانی ہستیست — بلا بجان جوانان پارسا ریزد
بسجدہ بر در یار افتیم تا غالب — خطِ جبین چو غبار از جبین ما ریزد

بہ بندِ پرسشِ حالم سخن توان افتاد — توان شناخت ز بندی کہ بر زبان افتاد
حدیثِ می بدف و چنگ در میان داریم — کنون کہ کار بہ شیخِ نہفتہ دان افتاد
فرو نیامدم از بسکہ بیخودم بطلب — ہزار بار گزارم بر آشیان افتاد

غمم چو ہم در فگندہ رو کہ مراد میدہد — دانہ ذخیرہ می کند کاہ بصیاد میدہد
آخر منزل نخست خوی تو راہ می زند — اول منزل دگر بوی تو زاد میدہد
اے کہ بدیدہ غم زتست وی کہ بسینہ غم زتست — نازشِ غم کہ ہم زتست خاطر شاد میدہد
مست عطای خود کند ساقی ما نہ مست می — بادہ زیاد می برد بسکہ زیاد میدہد
میدہیم بہ خلد جا رحم کجاست اے خدا — آب و ہوای این فضا گوی کہ یاد میدہد

دل اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غم نان شد — زراعتگاہ دہقان میشود چون باغ ویران شد
جنون کردیم و مجنون شہرہ گشتیم از خردمندی — برون دادیم رازِ غم جنوانی رہ پنہان شد

فراغت برنتابد همت مشکل پسند من / ز دشواری بجان می افتدم کاری که آسان شد

ز ما گرمست این هنگامه بنگر شور هستی را / قیامت می دمد از پردهٔ خاکی که انسان شد

قضا از ذوق معنی شیرهٔ میریخت در جانها / نمی از لای پالایش چکید و آب حیوان شد

چو اسکندر ز نادانی هلاک آب حیوانی / خوشا سوهن که هرکس غوطه زد در وی تنش جان شد

خدارا ای بتان گردش گردیدنی دارد / دریغا آبروی دیر گر غالب مسلمان شد

همچو رازی که به مستی ز دل آید بیرون / در بهاران همه بوی تو ز صبا می آید

راز از سینهٔ مضراب ز زیرم بیرون / ساز عاشق ز شکستن بصدا می آید

درهم افسردن اندام تو چون ما بخواست / خنده بر تنگی آغوش قبا می آید

رفته در حسرت نقش قدمی عمر بسر / جادهٔ را که بسر منزل ما می آید

اتفاق سفر افتاده به پیری غالب / آنچه از پای نیاید ز عصا می آید

خوش است آنکه با خویش جز غم ندارد / دلی خوشتر است آنکه این هم ندارد

سرابی که رخشد بویرانه خوشتر / ز چشمی که پیرایهٔ نم ندارد

گلگشت ز نوا زگست ره تماشا / تو داری بهاری که عالم ندارد

نگهدار خود را و ز آئینه بگذر / نگاه تو پروای خود هم ندارد

مژدهٔ صبح درین تیره شبانم دادند / شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب هرزه سرایم بستند / دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتشکده ز آتش نفسم بخشیدند / ریخت بتخانه ز ناقوس فغانم دادند
گهر از رایت شاهان عجم برچیدند / بعوض خامهٔ گنجینه فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند / بسخن ناصیهٔ فر کیانم دادند
گوهر از تاج گسستند و بدانش بستند / هرچه بردند به پیدا به نهانم دادند
هرچه در جزیه ز گبران مے ناب آوردند / شب جمعهٔ ماه رمضانم دادند
هرچه از دستگه پارس به یغما بردند / تا بنالم هم ازاں جمله زبانم دادند

می رمی از من و خلقی بگمانست ز تو / بیجا باش و منشین که گمان برخیزد
گر دهم شرح عتابے که بدلها داری / دود از کارگه شیشه گران برخیزد
باقدت سرو چو شخصیست که ناگه یکبار / بجهد از جا ز هجوم خفقان برخیزد
بچه گیرند عیار هوس و عشق دگر / رسم بیداد مبادا ز جهان برخیزد
زنهار از تب دوزخ جاوید مترس / خوش بهاریست کزو بیم خزان برخیزد
غم ما چرخ بگردد که جگر سوختهٔ / چون من از دودهٔ آذر نفسان برخیزد
گر دهم شرح ستمهائے عزیزان غالب / رسم امید همانا ز جهان برخیزد

گویم سخنی گرچه شنیدن نشناسد / صبحیست غمم را که دمیدن نشناسد
از بند چه بگشاید و از دام چه خیزد / ماتم و غزالی که رمیدن نشناسد
ساقی چه شگرفی کند و باده چه تندی / خون باد دماغی که رسیدن نشناسد
ما لذتِ دیدار ز پیغام گرفتیم / مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد
پیوسته روان از مژه خون جگرستم / رنگیست رخم را که پریدن نشناسد
تو نم مے گلگون بسبو ریز ند امشب / پیمانه ز ساقی طلبیدن نشناسد
بالذّت اندوهِ تو درساخته غالب / گوئی همه دل گشت و طپیدن نشناسد

هردم ز نشاطم دلِ آزاد بجنبد / تا کیست درین پرده که بے باد بجنبد

خوبان نه آن کنند که کس را زبان رسد / دل برد تا دگر چه از آن دلستان رسد
مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست / هرجا کنیم سجده بدان آستان رسد
گم شد نشان من چو رسیدم به کنج دیر / مانند آن صدا که بگوش گران رسد
در دام بهر دانه نیفتم مگر قفس / چندان کنی بلند که تا آشیان رسد
امید غلبه نیست به کیش مغان در آی / نی گر به جزیه دست نداد از غبن رسد
صاحبقرانِ ثانی اگر در جهان نماند / گفتارِ من به ثانیِ صاحبقران رسد

از ناله‌ام مرنج که آخر شدست کار | شمع خموشم و ز سرم دود میرود
فردوس جوی عمر بوسواس داده را | سرمایه نیز در هوس سود میرود

دانست کز شهادتم امید حور بود | برگشتم ز دین دم بسمل ضرور بود
رفت آنکه ما ز حسن مدارا طمع کنیم | سررشته در کف ارنی گوی طور بود
مجرم مسنج رند اناالحق سرای را | معشوقه خود بجای نگهبان غیور بود
نازم بامتیاز که بگذشتن از گناه | با دیگران ز عفو و با ما ز غرور بود
قطع پیام کردی و دانستم آشتیست | دلاله خوبروی و دلم ناصبور بود
دادی صلای جلوه و غالب کناره کرد | کو بخت آن گدا که ز غوغا نفور بود

ز گرمی نگهت خون دل بجوش آمد | ز شادی ستمت سینه در خروش آمد
فدای شیوهٔ رحمت که در لباس بهار | بعذرخواهی رندان باده نوش آمد
زمام حوصله نگرفت و کوهکن جان داد | چه زمزم شانه گذشت و چه بخت گوش آمد
ترا جمال و مرا مایهٔ سخن سازیست | بهار زینت دکان گلفروش آمد

بعشق از دو جهان بے نیاز باید بود | مجاز سوز حقیقت گداز باید بود

چو لب ز ہرزہ نوایانِ شوق نتوان شد
چو دل ز پردہ سرایانِ راز باید بود

چو بزمِ عشرتیان تازہ رو توان جوشید
چو شمعِ خلوتیان جان گداز باید بود

چو شوق بال کشاید توان بخود بالید
چو ناز جلوہ گراید نیاز باید بود

بہ صحنِ میکدہ سرمست میتوان گردید
بہ کنجِ صومعہ وقفِ نماز باید بود

نگہ ز دیدۂ بیدار جو کہ سائل را
بہ گدیۂ طلب درہائے باز باید بود

بہ بر ز راحتِ آزادگی خوری غالب
ترا کہ این ہمہ با برگ و ساز باید بود

شادم بخیالت کہ ز تابم بدر آورد
از کشمکشِ حسرتِ خوابم بدر آورد

جان بر سرِ مکتوبِ تو از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریرِ جوابم بدر آورد

ساقی نگہی تا بشناسم زچہ جامست
آن بادہ کہ از بندِ حجابم بدر آورد

غالب ز عزیزانِ وطن بودہ ام اما
آوارگی از قیدِ حسابم بدر آورد

منم بوصل بہ گنجینہ راہ یافتہ دزدی
کہ در ضمیرِ تو از بیمِ پاسبانش دلرزد

دگر بکامِ خود اے دل چہ بہرہ بُرد توانی
ز سادہ کہ زنی بوسہ بر دہانش دلرزد

ز شیخ وجد بذوقِ نشاطِ نغمہ نیابی
مگر بدل گزرد مرگِ ناگہانش دلرزد

فغان ز خجلتِ حرفِ کم عیار کہ ناگہ
بر آورند زرِ قلب از دکانش دلرزد

گر از فشاندن جان شور نیست در سر غالب — چرا به سجده نهد سر بر آستانش و لرزد

آنانکه وصل یار همی آرزو کنند — باید که خویش را بگداز آرزو کنند
می نالی از نی که به ناخن شکسته اند — اے وائی ناخنی بدلت گره کنند
آلوده ریا نتوان بود غالبا — پاکست خرقه که به می شست و شو کنند

چون گویم از تو بر دل شیدا چه میرود — بنگر بر آبگینه ز خارا چه میرود
گوئی مباد در شکن طره خون شود — دل زان تست از گره ما چه میرود
با ما که محو لذت بیداد گشته ایم — دیگر سخن ز مهر و مدارا چه میرود
هفت آسمان بگردش و ما در میانه ایم — غالب دگر مپرس که بر ما چه میرود

ناز از شرمست کز چشم وے آسان بر نمی آید — نگاهش با درازیهای مژگان بر نمی آید
سرت گردم بزن تیغ و دری بر روی دل بکشا — دلم تنگست کار از زخم پیکان بر نمی آید
بجو آسودگی گر مرد راهی کاندرین وادی — چو خار از پا بر آید پا ز دامان بر نمی آید
بر آر از بزم بحث اے جذبۂ توحید غالب را — که ترک سادۂ ما با فقیهان بر نمی آید

چه عیش از وعده چون باور ز عنوانم نمی آید — بخوئی گفت می آیم که پیدانم نمی آید

گزشتم زانکه بر زخم دل صد پاره خون گرید — خود او را خنده بر چاک گریبانم نمی آید

براه کعبه زادم نیست شادم کز سبک رُی — برفتن پائے بر خار مغیلانم نمی آید

دلش خواهد که تنها سوی من روی آورد لیکن — فریب همرهان دانم ز نادانم نمی آید

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوه ها دارم — گرفتم رحمه بر فریاد و افغانم نمی آید

ندارم باده غالب گر سحرگاهش سر راهی — به بینی مست دانی کز شبستانم نمی آید

بلم از نام تو آن مایه پرستی که اگر — بوسه بر غنچه زنم غنچه نگیند تو شود

چون به سجده که نتوانست بجا بهد از شرم — ماه پیچند ببالد که جبین تو شود

چشم و دل باخته ام دهر خواهد داد — آنکه چون من همه دانُ همه بین تو شود

کفر و دین چیست جز آلایش پندار وجود — پاک شو پاک که هم کفر تو دین تو شود

دوزخ تافته هست نهادت غالب — آه ازان دم که دم بازپسین تو شود

خیز در ماتم ما سرمه فرو شو از چشم — وقت مشاطگی حسن خداداد آمد

رفته بودی دگر از جا به سخن سازی غیر — منت از بخت که خاموشی ما یاد آمد

خشک و تر سوزی این شعله تماشا دارد — عشق گرتاب کن بندهٔ آزاد آمد

تا نه دانی جگر سنگ کشودن بدست — تیشه داند که چها بر سر فرهاد آمد

داده ذوق نفسی زین خیالم غالب — رنگ بر روئے من از سیلی استاد آمد

دوش کز گردش بختم گله بر روی تو بود
چشم سوی فلک و روی سخن سوی تو بود

دوست دارم گرهی را که بکارم زده اند
کاین همانست که پیوسته در ابروی تو بود

شب چه دانی ز تو در بزم بخوبان چه گذشت
خاصه بر صدرنشینی که به پهلوی تو بود

هم از آن پیش که مشاطه بدآموز شود
نقش هر شیوه در آئینهٔ زانوی تو بود

لاله و گل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چها در دل غالب هوس روی تو بود

هم بسودای تو خورشید پرستم بے
دل ز مجنون برد آهو که به لیلا ماند

شکوهٔ دوست ز دشمن نتوانم پوشید
گر غم هجر چنین حوصله فرسا ماند

در بغل دشنه نهان ساخته غالب امروز
مگذارید که ماتم زده تنها ماند

همره روش کوثر و حوران که دم مرگ
ذوق می ناب و هوس روی نکو برد

دی رند بهنگامه تجمل کرد عسس را
می خورد و هم از میکده آبی بسبو برد

ما را نبود هستی و او را نبود صبر
دستی که ز ما شست بخون که فرو برد

یک گریه پس از ضبط دو صد گریه رضا ده
تا تلخی آن زهر توانم ز گلو برد

گردم سر آوازهٔ آزادگی خویش
صد ره بهم بند و گرفتار ندانند

پیمانه بر آن رند حرام است که غالب
در بیخودی اندازهٔ گفتار ندانند

خوشا کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد — اگرچہ خود ہمہ بر فرقِ من فرو ریزد
بریدہ ام رہ دوری کہ گر بیفشانم — بجائے گرد رواں از بدن فرو ریزد
دہد بہ مجلسیان بادہ و بنوبتِ من — بمن نماید و در انجمن فرو ریزد
بمن بسازد و بداں غمزہ می بجام مریز — کہ ہوشم از سر و تابم ز تن فرو ریزد
رواست غالبؔ اگر دُرّ قائلش گوئے — کہ از لبش ز روانی سخن فرو ریزد

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد — زہے روانیِ عمری کہ در سفر گزرد
بوصل لطف باندازۂ تحمّل کن — کہ مرگ تشنہ بود آب چوں زسر گزرد
حریفِ منّتِ احباب نیستم غالبؔ — خوشم کہ کارِ من از سعیِ چارہ گر گزرد

تا تو بہ عزمِ حرم ناقہ فگندی براہ — کعبہ ز فرشِ سیاہ مردمک حرام شد
دیگرم از روزگار شکوہ چہ درخور بود — نالہ شرر تاب شد اشک جگر فام شد

مَی بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب — پیشِ ایں قوم بشورابۂ زمزم نرسد
ہرچہ بینی بجہاں حلقۂ زنجیری ہست — ہیچ جا نیست کہ ایں دائرہ باہم نرسد

آزادگیست سازی اما صدا ندارد — از ہرچہ درگزشتم آوازِ پا ندارد

عشقست و ناتوانی حسنست و سرگرانی | جور و جفا شنایم مہر و وفا ندارد
اے سبزۂ سرِ رہ از جور پا چہ نالی؟ | در کیش روزگاراں گل خوں بہا ندارد
ہر مطلعی کہ ریزد از خامہ ام فغانیست | جز نغمۂ محبت سازم نوا ندارد
جاں در غمت فشاندن مرگ از قفا ندارد | تن در بلا فگندن بیمِ بلا ندارد
چشمی سیاہ دارد یعنی بما نہ بیند | روئے چو ماہ دارد اما بما ندارد
چوں لعلِ تست غنچہ اما سخن نداند | چوں چشم تست نرگس اما حیا ندارد

خونی کہ دی بہ جیبم از وخار خار بود | امروز گل بدامن جلاد میزند
زیں بیش نیست قافلۂ رنگ را درنگ | گل یک قدح بسایۂ شمشاد میزند

باید زمی ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند | "آری دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند"
خوں ریختن بگوئی تو کردار چشم ماست | مردم ترا برائے چہ خونریز گفتہ اند
نازی بصد مبالغہ عجزی بصد خشے | گر از تو گفتہ اند زمانیز گفتہ اند
غالب ترا بدیر مسلماں شمردہ اند | آری دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

گفتم گرہ ز کار دل و دیدہ باز کن | از جبہہ ناکشودہ بہ بند نقاب زد
غالب کساں ز جہل حکیمش گرفتہ اند | بیدانشے کہ طعنہ بر اہل کتاب زد

گر قضا سازِ تلافی در خورِ عشرت کند
آہ ازاں خونابہ کاندر جامِ فغفور افگند

گر مسلمانی یکے بیں زرد و ہشت آنکہ او
اختلافے درمیانِ ظلمت و نور افگند

نمی گیری بخون خلق بے پروا نگاہاں را
تواند بود یارب بعدِ محشر محشری باشد

دل نہ تنہا ز فراق تو فغاں سازدہد
رفتنِ عکسِ تو از آئینہ آواز دہد

دل چو بیند ستم از دوست نشاط آغازد
شیشہ سازیست کہ تا بشکند آواز دہد

بای پُرکاریِ ساقی کہ بہ اربابِ نظر
می باندازہ و پیمانہ باندازہ دہد

چوں تنازد سخن از مرحمتِ دہر بخویش
کہ بُرَد عرفی و غالب بعوض باز دہد

عشوۂ مرحمتِ چرخِ مخر کایں عیّار
یوسف از چاہ برآرد کہ ببازار برد

جوہرِ طبعم درخشاں ست لیک
رو در مہ .ندرا بر پنہاں میرود

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار
چوں رود از دست آساں میرود

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں میرود

آید از ذوقِ نشاسم کہ کیست
تا رود پنداشتی جاں میرود

ہر کہ بیند در روِشش گوید بیٔے
قبلۂ آتش پرستاں میرود

کیست تا گوید بدان ایوان نشیں   انچه بر غالب ز دربان میرود

نومیدی ما گردش ایام ندارد   روزی که سیه شد سحر و شام ندارد
بلبل بچمن بنگر و پروانه بمحفل   شوقست که در وصل هم آرام ندارد
بوسی کز ربایند بمستے زلب یار   لغزست ولی لذتِ دشنام ندارد

چه خیزد از سخنے کز درون جان نبُوَد   بریده باد زبانے که خونچکان نبُوَد
امید بوالهوس و حسرتِ من افزوں شد   ازیں نوید که اندوه جاودان نبُوَد
بالتفات نگارم چه جائے تهنیت ست   دعا کنید که نوعی ز امتحان نبُوَد
عجب بود سر همخوابے کسی غالب   مرا که بالش و بستر ز پرنیان نبُوَد

دلستانان بہلند ارچه جفا نیز کنند   از وفائے که بگردند حیا نیز کنند
خون ناکامی سی ساله هدر خواهد بود   مهر با ما گر از بهر خدا نیز کنند
اندراں روز که پرسش رود از هرچه گزشت   کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند
حلق غالب بگرو دشنهٔ سعدی که سرود   خوبرویان جفا پیشه وفا نیز کنند

چه ذوق رهروی آنرا که خارخاری نیست   مرو به کعبه اگر راه ایمنی دارد

بادہ گر بُوَدم میل شاعرم نہ فقیہ — سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد
خوشم بہ بزم ز اکرام خویش و زین غافل — کہ می نماندہ و ساقی فروتنی دارد
بیا و رید گر اینجا بود زباندانے — غریبِ شہر سخنہاے گفتنی دارد

تو داری دین و ایمانی بترس از دیو و نیرنگش — چو بُوَد توشہ راہی چہ باک از رہزنم باشد
بدان تا با من آویزد چو حرفِ ننگ بوگوید — دلم با اوستی اما زبان با کلکشم باشد
بزر ہمدوش قارون خفتن از دون ہمی خیزد — بیا تا در سخن پیچم کہ غالب ہمنفسم باشد

خانۂ زنبور شد کلبہ ام از دستِ چرخ — بسکہ ز آب و گلم رغبتِ تعمیر برد

تا چند بو الہوس می و عاشق ستم کشد — کو فتنہ تا بداورے ہم علم کشد
دشوار نیست چارۂ عیش گریز پاے — دورِ قدح چو سلسلہ گر سر بہم کشد
شوقم کہ روشناسِ دلِ نازنین تست — کی منت نوشتن و ناز قلم کشد
صہبا حلال زاہد شب زندہ دار را — اما بشرطِ آنکہ ہمان صبحدم کشد
از تازگی بہ ہر مکررے نے شود — نقشیکہ کلکِ غالبِ خونین رقم کشد

گفتند حور و کوثر و دادند ذوقِ کار — منعست نام شاہد و مے آشکار برد

می داد بذلہ جست مگر ابر وقت نیم کاورد قطرہ و گہر شاہوار برد
پیشم از آن بپرس کہ پرسی ز اہل کوے گویند خستہ زحمت خود زین دیار برد
نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئی تو ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

تنگست دلم حوصلہ راز ندارد آہ از نے تیر تو کہ آواز ندارد
تمکین برہمن دلم از کفر بگرداند بت خانہ بتے خانہ برانداز ندارد
بے حیلہ ز خوبان نتوان چشم ستم داشت رحمت بران خستہ کہ غماز ندارد
کیفیت عرفی طلب از طینت غالب جام دگران بادۂ شیراز ندارد

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد غالب آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ہر ذرہ را فلک بہ زمین بوس میرسد گر خاک راست دعوئی ناموس میرسد
بیرون میا ز خانہ بہ ہنگام نیمروز رشک آیدم کہ سایہ بپا بوس میرسد
سجادہ رہن می نپذیرفت میفروش کایں را نسب بخرقۂ سالوس میرسد

دریغا کہ کام و لب از کار ماند سخنہاے ناگفتہ بسیار ماند
ادا نیست او را کہ از دلربائی نہفتن ز شوخے بہ اظہار ماند

ز قحطِ سخن ماندم خامهٔ غالب — به نخلی کز آوردن بار ماند

ازان سرمایهٔ خوبی بوصلم کام دل جستن — بدان ماند که موری خرمنی را در کمین باشد

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج — دانا خورد دریغ که نادان چه کار کرد
از بسکه در کشاکشم از کار رفت دست — بندم اگر گسستن بند استوار کرد
آمد بزعم من قدح از دستِ من بخاک — افراطِ ذوق دستِ مرا رعشه دار کرد
نومیدی از تو کفر و تو راضی نه بکفر — نومیدیم دگر بتو امیدوار کرد

بشرع آویز و حق میجو کم از مجنون نبادی — دلش با محملست اما زبان با ساربان دارد
خدا را وقت پرسش نیست گفتم بگذر از غالب — که هم جان برلب و هم داستانها بر زبان دارد

آن خود ببازی می برد این را دو جو نشمرد — نمودمش دین خنده زد آوردمش جان خوش نکرد
با من میاویز ای پدر فرزند آزر را نگر — هر کس که شد صاحب نظر دینِ بزرگان خوش نکرد
غالب بفنِ گفتگو نازد بدین ارزش که او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خان خوش نکرد

قدر مشتاقان چه داند درد ما چندش بود — آنکه دائم کار با دلهای خرسندش بود

باخرد گفتم نشانِ اہلِ معنے بازگوے	گفت گفتاری کہ با کردار پیوندش بود

کسی با من چہ در صورت پرستی حرفِ دین گوید	ز آزر گفت دانم گر ز صورت آفریں گوید
دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم	کہ با من وسعتِ بتخانہائی ہند و چیں گوید
بخشم نامزا میگوید و از لطفِ گفتارش	گمان دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید
چرا رانند غالبؔ را ازان در رہروی باید	کہ رازِ خلوتِ شہ با گدائے رہ نشیں گوید

من بوفا مُردم و رقیب بَدَر زد	نیمہ لبش انگبیں و نیمہ تیر زد
کیست درین خانہ کز خطوطِ شعاعے	مہر نفس ریزہ ہا بہ روزنِ دَر زد
لشکرِ ہوشم بزورِ مے نہ شکستی	غمزۂ ساقی نخست راہ نظر زد
برگِ طرب ساختیم و بادہ گرفتیم	ہر چہ ز طبعِ زمانہ بیہدہ سر زد
شاخ چہ بالد گر ارمغانِ گل آرد	تاک چہ نازد اگر صلائے ثمر زد
کام نہ بخشیدہ گنہ چہ شمارے	غالبِ مسکیں بالتفات نیرزد

ترا تنیست کہ بروی سمن خَسک پاشد	مرا دلیست کہ در وی نشاط غم گردد
بدیں قدر کہ لبے تر کنے و من بمکم	ترا ز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد
سبک سریست بدریوزۂ طرب رفتن	خوشا دلے کہ باندوہ محتشم گردد

گرفته خاطر غالب ز هند و اعیانش
بدان سرست که آوارهٔ عجم گردد

سخت است دل عیر و گرانز تنگ تگوے
برگشتن مژگاں تو گویہ کہ چہ رو داد

شائستہ ہمیں ما و تو بودیم کہ تقدیر
ما را سخن نغز و ترا روی نکو داد

ساقی دگرم بُرد بہ میخانہ ز مسجد
می یک دو قدح بود و فریبم بسبو داد

زیں سادہ دلی داد کہ چوں دید بخوابم
ترسیدہ خود و مژدهٔ مرگم بعدو داد

حسن تو بساقی گری آئین نشناسد
مست آمد و یکبار دو ساغر زد و بود

تونالی از خلد خار و نگرے کہ سپہر
سر حسینؑ علیؑ بر سناں بگرداند

بروز شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا
چو قرعہ بر نمط امتحاں بگرداند

یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباس شباں بگرداند

گر رفتہ ام ز کوئی تو آساں نرفتہ ام
ایں قصہ از زبان عزیزاں شنیدہ باد

نغزی و خود پسندی ببینم چہ سیکنے
یا رب بہ بہر ہیچ تو ئی آفریدہ باد

غالب شراب تندی بندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

در تیغ زدن منت بسیار نہادند
بُردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

داغِ دلِ ما شعله‌فشاں ماند به پیری
ایں شمعِ شب آخر شد و خاموش نکردند

روزی که به می زور و به نی شور نهفتند
اندیشه بکارِ خرد و ہوش نکردند

گر خود بغلامے نه پذیرند گدا باش
بر در بزن آں حلقه که در گوش نکردند

غالب ز تو آں باده که خود گفت نظیری
در کاسۂ ما بادۂ سر جوش نکردند

تاجرِ شوق بدل ره تجارت نزود
که ره انجامد و سرمایه بغارت نزود

قصر و مهمانکدۂ حاتم و کسریٰ بگذار
نام از رفتنِ آثارِ عمارت نزود

رمز فناس که بہر نکته ادائے دارد
محرم آنست که ره جز باشارت نزود

بتی دارم ز تشنگی روزگاراں خوبہاراں
به مستی خویش ار گردِ آرد گوی از ہوشیاراں بر

ندارد شیر خرما ذوقِ صهبا رحم می آید
نشاطِ عید از ما بدیه سوی روزه داراں بر

مژده اے ذوقِ خرابی که بہارست بہار
خرد آشوب تر از جلوۂ یارست بہار

شوخیِ خوی ترا قاعده دانست خزاں
خوبیِ روئی ترا آئینه دارست بہار

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

ز من بجرمِ تپیدن کناره می کردے
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

شنیده ام که نه بینی و نا امید نیم — ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانه و بالید و آشیان گم شد — در انتظار هما دام چیدنم بنگر
نیازمندی حسرت کشان نمی دانی — نگاه من شو و دزدیده دیدنم بنگر
بهار من شو و گل گل شگفتنم دریاب — بخلوتم بر و ساغر کشیدنم بنگر

من آن نیم که ز مرگم جهان بهم نخورد — فغان زاهد و فریاد برهمن یاد آر
بخود شمار وفاهای من ز مردم پرس — بمن جواب جفاهای خویشتن یاد آر
هزار خستہ و رنجور در جهان داری — یکی ز غالب رنجور خستہ تن یاد آر

عمری که بسودای تو گنجینهٔ غم بود — اینک تو دادیم تو در عیش بسر بر
مطرب بغزلخوانی و غالب بسماعست — ساقی می و آلات می از حلقه بدر بر

ای دل از گلبن امید نشانی بمن آر — نیست گر تازه گلی برگ خزانی بمن آر
یارب این مایهٔ وجود از عدم آوردهٔ تست — بوسهٔ چند هم از گنج دهانی بمن آر
سخن ساده دلم را نفریبد غالب — نکتهٔ چند ز پیچیده بیانی بمن آر

ای ذوق نواسنجی بازم بخروش آور — غوغای شبیخونی بر بنگه هوش آور

گر خود بجهد از سر از دیده فرو بارم   دل خون کن و آن خون را در سینه بجوش آور

هان همدم فرزانه دانی رهِ ویرانه   شمعی که نخواهد شد از باد خموش آور

شورابهٔ این وادی تلخ است اگر رادی   از شهر بسوئے من سرچشمهٔ نوش آور

دانم که زری داری هر جا گذری داری   می گر ندهد سلطان از باده فروش آور

گر مغ به کدو ریزد بر کف نه و راهی شو   ور شه بسبو بخشد بردار و بدوش آور

ریحان دمد از مینا رامش چکد از قلقل   آن در رهِ چشم افگن این از پے گوش آور

گاہے بسبکدستی از باده ز خویشم بر   گاہے بسیه مستی از نغمه بهوش آور

غالب که بقایش باد همپائے تو گر ناید   باری غزلی فردی زاں موئنه پوش آور۔

در گریه از بس نازکی رخ مانده بر خاکش نگر   وان سینه سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر

برقی که جانها سوختی دل از جفا سردش ببین   شوخی که خونها ریختی دست از حنا پاکش نگر

آن کو بخلوت با خدا هرگز نکردے التجا   نالان به پیش هر کسے از جورِ افلاکش نگر

تا نام غم بردی زبان میگفت دریا در میان   دریائے خون کنون روان از چشم سفاکش نگر

آن سینه کز چشم جهان مانند جان بودی نهان   اینک ز پیراهن عیان از روزنِ چاکش نگر

بر بستان دیگرے در شکر در بالش ببین   در کوی از خود بستری در رشک خاشاکش نگر

با خوبی چشم و دلش با گرمی آب و گلش   چشم گهر بارش ببین آه شرر ناکش نگر

خواند بامیدِ اثر اشعارِ غالب بر سحر   از نکته چینے در گذر فرهنگ و ادراکش نگر

هر برق کز نظاره گداز است نهادش　　بگذار و به پیمانهٔ ذوق نظرم ریز

رقیب یافته تقریب رخ بپا سودن　　ترا که گفت که از بزم سرگران برخیز
سبوچهٔ ذمت بر سحر زمی غالب　　خدای را ز سر کوچهٔ مغان برخیز

با همه گم گشتگی خالی بود جایم هنوز　　گاه گاهی در خیال خویش می آیم هنوز
تا سر خاری کدامین دشت در جان میخلد　　کز هجوم شوق می خارد کف پایم هنوز
خشک شد چندانکه جزو بدن شد نشتر را　　همچنان گوئی در انگور است صهبایم هنوز
بعد مردن مشت خاکم در نورد حسرت است　　بیقراری میزند موج از سراپایم هنوز
تازه دور افتادهٔ ظرف بساط عشرتم　　میتوان افشرد می از رای پامالیم هنوز
صد قیامت در نورد هر نفس خون گشته است　　من ز خامی در فشار بیم فردایم هنوز
تا کجا یارب فرو شست اشک من ظلمت خاک　　لاله بیداغ از زمین روید بصحرایم هنوز
با تغافل بر نیامد طاقتم یک از هوس　　در تمنای نگاه بی محابایم هنوز

لطفی بتهمت نگه خشمگین شناس　　آرایش جبین شکن از جبین شناس
آرایش زمانه ز بیداد کرده اند　　هر خون که ریخت غازهٔ روی زمین شناس
بی غم نه باده دگر امی نشود　　زنهار قدر خاطر اندوهگین شناس

غالب مذاق ما نتوان یافتن ز ما　　رو شیوهٔ نظیری و طرز حزین شناس

تیغ از نیام بیهده بیرون نکرده کس　　ما را بهیچ کشته و ممنون نکرده کس
فرصت ز دست رفته و حسرت فشرده پای　　کار از دوا گذشته و افسون نکرده کس
یارب بزاهدان چه دهی خلد رایگان　　جور بتان ندیده و دل خون نکرده کس
غالب ز حسرتی چه سرائی که در غزل　　چون او تلاش معنی و مضمون نکرده کس

همه محسوس بود ایزد عالم معقول　　غالب این زمزمه آواز نخواهد خاموش

بعرض شهرت خویش احتیاج ما دارد　　چو شعلهٔ که نیاز او فتد بخار و خسش
ز رنگ و بوی گل و غنچه در نظر دارم　　غبار قافلهٔ عمر و نالهٔ جرسش
مرا بغیر ز یک جنس در شمار آورد　　فغان که نیست ز پروانه فرق تا مگسش
جگر ز گرمی این جرعه تشنه تر گردید　　فغان ز طرز فریب نگاه دیر رسش
خوشم که دوست خود آمایه بیوفا باشد　　که در گمان نسگالم امیدگاه کسش
بهار پیشه جوانی که غالبش نامند　　کنون ببین که چه خون میچکد ز هر نفسش

به خلد از سردی هنگامه خواهم　　برافروزم بگرد کوثر آتش

بدان ماند ز شاہد دعوی مہر — کہ ریزد از دم افسون گر آتش
قمر در عقرب و غالب بدہلی — سمندر در شط و ماہی در آتش

قطرۂ خونی گرہ گردید دل دانستمش — موج زہرابی بطوفان زد زبان نامیدمش
غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش — کرد تنگی حلقۂ دام آشیان نامیدمش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم — کعبہ دیدم نقش پای رہروان نامیدمش
بر امید شیوۂ صبر آزمائی زیستم — تو بریدی از من و من امتحان نامیدمش
بود غالب عندلیبی از گلستان عجم — من ز غفلت طوطی ہندوستان نامیدمش

ز لکنت می تپد نبض رگ لعل گہربارش — شہید انتظار جلوہ خویشست گفتارش
بدین سوزم روحی نیست بی فرہاد ناکام — کز آب شرار تیشہ گرمست بازارش
بدا گر دوست زندان مرا تاریک بگذارد — بدین حسنی کہ در گیرد چراغ از تاب رخسارش

اگر بادہ گرانست قدح ز نرگس خواہ — وگر سحاب نہ شبنم برشتہ گوہر کش
بدین ترانہ کہ ممنوع نیست مستی کن — از آن شراب کہ نبود حرام ساغر کش
مذاق مشرب فقر محمدی داری — می مشاہدۂ حق بنوش و دم درکش
نشاط ورز و گہرپاش و شادمانی کن — جہان ستان و قلمرو کشی و لشکر کش

ترا کہ گفت کہ منت کشی ز چرخ کبود
بقہر کام دل خویشتن ز اختر کش

چون عکس پل بسیل بذوق بلا برقص
جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

نبود وفای عہد دمی خوش غنیمت ست
از شاہدان بنازش عہد وفا برقص

ذوقیست جستجو چہ زنے دم ز قطع راہ
رفتار گم کن و بصدائے درا برقص

در عشق انبساط بپایان نمیرسد
چون گرد باد خاک شو و در ہوا برقص

فرسودہ رسمہائے عزیزان فرو گزار
در سور نوحہ خوان و بہ بزم عزا برقص

چون خشم صالحان و ولائے منافقان
در نفس خود مباش و لے برملا برقص

از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوے
بیہودہ در کشاکش سموم و صبا برقص

غالب بدین نشاط کہ وابستۂ کۂ
بر خویشتن ببال و بہ بند بلا برقص

دل در غمش بسوز کہ جان میدہد عوض
ور جان دہی غمی بہ از آن میدہد عوض

فارغ مشو ز دوست بمی در ریاض خلد
از ما گرفت آنچہ ہمان میدہد عوض

سرمایۂ خرد بجنون دہ کہ این کریم
یک سود را ہزار زیان میدہد عوض

نبود سخن سرائی ما رائگان کہ دوست
دل میبرد ز ما و زبان میدہد عوض

نازم بدست سبحہ شماریکہ عاقبت
شوقش کف پیالہ ستان میدہد عوض

پاداش ہر وفا بجفائے دگر کند
غالب ببین کہ دوست چسان میدہد عوض

گوئی کہ ہاں وفا کہ وفا بودہ است شرط
آری ہمیں ز جانب ما بودہ است شرط

لب بر لبت نہادن و جاں دادن آرزوست
در عرض شوق حسن ادا بودہ است شرط

تا نگذرم ز کعبہ چہ بینم کہ خود نہ دید
رفتن بہ کعبہ رو بقفا بودہ است شرط

غالب بعالمی کہ توئی خون دل بنوش
از بہر بادہ برگ و نوا بودہ است شرط

تکیہ بر عہدِ زبانِ تو غلط بود غلط
کایں خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود غلط

آنکہ گفت از من دلخستہ بہ پیش تو رقیب
کہ غلط بود بجانِ تو غلط بود غلط

غنچہ را نیک نظر کردم ادائے دارد
دیں کہ مانند بدہانِ تو غلط بود غلط

دل نہادن بہ پیامِ تو خطا بود خطا
کام جستن ز لبانِ تو غلط بود غلط

آخر اے بوقلمون جلوہ کجائی کاینجا
ہر چہ دادند نشانِ تو غلط بود غلط

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ
ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ

خوشست کوثر و پاکست بادہ کہ درست
ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

چنیں کہ نخل بلندست و سنگ ناپیدا
ز میوہ تا نفتد خود ز شاخسار چہ حظ

بہ بند زحمت فرزند و زن چہ می کشیم
ازیں نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ

تا رغبت وطن نبود از سفر چہ حظ
آنرا کہ نیست خانہ بہ شہر از خبر چہ حظ

دلهای مرده را ز نشاط نفس چه کار — گلهای چیده را ز نسیم سحر چه حظ
تا فتنه در نظر نهی از نظر چه سود — تا دشنه بر جگر نخوری ز جگر چه حظ
تا سوی کاخ روزن دیوار بسته اند — بی دوست از مشاهدهٔ بام و در چه حظ
چون پردهٔ محافه به بالا نمی‌زند — از وی بداعیان سر رهگذر چه حظ

تا الفت شوق تو انداخته جاں در تن شمع — تر از رشتهٔ خویشست به پیرهن شمع
جمعی از دل و جانست بگرد در دوست — توده از پر و بالست به پیراهن شمع
روزم از تیرگی آن وسوسه ریزد بنظر — کز شب تار بهنگام فرو مردن شمع
نازم آن حسن که در جلوه ز شهرت باشد — خاطر آشوب گل و قاعده برهمزن شمع
بر نتابد ز تبان جلوه گرفتار کسی — صبح را کرده هوا داری گل دشمن شمع
می گدازم نفسی بی شرر و شعله و دود — داغ آن سوز نهانم که نباشد فن شمع
وقت آرایش ایوان بهارست که باز — کوه از جوش گل و لاله بود معدن شمع
غالب از هستی خویشست عذابی که مراست — هم ز خود خار نم آویخته در دامن شمع

شادم که با انکار من شیخ و برهمن گشته جمع — کز اختلاف کفر و دین خود خاطر من گشته جمع
مقتول خویشان خودم جوید خون ریز مرا — زینان که بر نعشم منند از بهر شیون گشته جمع
در گریه تا رفتم ز خود ندهم از سر تازه شد — بر هیئت دل لخت دل بازم بدامن گشته جمع

هی هی چه خوش باشد بدی آتش به پیش و زغم دمی
از بند بیسنجان چند کس در یک نشیمن گشته جمع
صحبت دگرگوناگون اثر غالب چه خسپی بیخبر
نیکان بمسجد رفته در رندان بگلشن گشته جمع

اگر بمهر نخواندی بناز خواب گشت
نه هرچه وعده کنی سربسر دروغ دروغ
دگر کرشمه در ایجاد شیوهٔ نگهیست
تو در عربده قطع نظر دروغ دروغ
درین ستیزه ظهوری گواه غالب بس
من از کوی تو عزم سفر دروغ دروغ

هنگام بوسه بر لب جانان خورم دریغ
در تشنگی بچشمهٔ حیوان خورم دریغ
دل زان تست هدیهٔ تن کن کنار و بوس
چند از تو بر نوازش پنهان خورم دریغ

سعی در مرگ رقیبان گرانجان کردی
می شناسم که چه از ناز و ادا گشت تلف
آمدی دیر به پرسش چه بشارت آرم
من و عمری که باندوه وفا گشت تلف
رنگ و بو بود ترا برگ و نوا بود مرا
رنگ و بو گشت کهن برگ و نوا گشت تلف
گیرم امروز دهی کام دل از حسن کجا
اجر ناکامی سی سالهٔ ما گشت تلف
کاش پاسی فلک از سیر بماندی غالب
روزگاری که تلف گشت چرا گشت تلف

ای کرده غم تیغ خبر شورش نشانها بیطرف
زخم بساحل یکطرف کشتم بدریا یکطرف

تادل بدنیا دادہ ام درکشمکش افتادہ ام   اندوہ فرصت یکطرف ذوق تماشا یکطرف

بجز دمی نکند خستہ ام چو سنگ در آب   ہجوم ریزش غمہاے سخت و قلب رقیق
براہ کعبہ ہما کم سے کنے یاور   تو اے کہ بیہدہ باز آمدی زبیت عتیق
ترا بہ پہلوے میخانہ جا دہم غالب   بشرط آنکہ قناعت کنی بہ بوی رحیق

بزم بادہ گریبان کشود لنش نگرید   خوشا بہانۂ مستے خوشا رعایت شوق
ہران غزل کہ مرا خود بخاطرست ہنوز   بہ بانگ چنگ ادا می کند رعایت شوق
دہان ز آتش یاقوت گردد عجبیت   عجب ترست ازین ریش حکایت شوق
ترا ز پرسش احباب بے نیاز کند   غرور یکدلی و زنازش حمایت شوق

مرد آنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک   از رشک تشنہ کہ بدریا شود ہلاک
تا مرد را بلخلخہ آسائش مشام   مرد از تف سموم بہ صحرا شود ہلاک
نعم لذتیست خاص کہ طالب بذوق آن   پنہان نشاط ورزد و پیدا شود ہلاک

بحر اگر موج زنست از خس و خاشاک چہ باک   با تو ز اندیشہ چہ اندیشہ زبک چہ باک
کشتی نیست اگر خانہ چراغے دارد   با دل از تیرگی زاویۂ خاک چہ باک

کلک ما تا بکف ماست ز دشمن چہ ہراس
چون فریدون علم آراست ز ضحاک چہ باک
طبع از دخل خساں باز نہ استد ز سخن
شعلہ را غالب از آویزش خاشاک چہ باک

ازیں پرسش کہ بسیارست از تو
شد اندوہ دل زار من اندک
ز خاصانت گرے گوہری ہست
کہ میداند ز اسرار من اندک
وجودم خوان یغما بود غم را
تو ہم بروے ز بسیار من اندک
نگویم تا نباشد نغز غالب
چہ غم گر ہست اشعار من اندک

اے ترا و مرا دریں نیرنگ
دہن و چشم و دست و دل ہمہ تنگ
شکوہ و شکر ہرزہ و باطل
غالب و دوست آبگینہ و سنگ

نہ مراد دولت دنیا نہ مرا اجر جمیل
نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل
غالب سوختہ جاں را چہ بگفتار آری
بدیاری کہ ندانند نظیری ز قتیل

زاں شعر کہ در شکوۂ خوے تو سرایم
لفظم ز زباں ماند و مضموں رود از دل

گفتم ز شادی نبودم گنجیدن آساں در بغل
تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل

نازم خطر ورزیدنش وان مژہ دل لرزیدنش | چینی ببازی بر جبیں دستی بہ دستاں در بغل
آہ از تنک پیراہنی کاذوق شدنش تردامنی | تا خوی بروں داد از حیا گردید عریاں در بغل
دانش ہمی درباختہ خود را ز من نشناختہ | رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل
گاہم بہ پہلو خفتہ خوش بستہ لب از حرف و سخن | گاہم بہ بازو ماندہ سر سوری ز خنداں در بغل
ناخواندہ آمد صبحگہ بند قبائش بے گرہ | واندر رہ طلب منشور شہ نکشودہ عنواں در بغل
ہاں غالب خلوت نشیں ہمی چناں عیشی جنیں | جاسوس سلطاں در کمیں مطلوب سلطاں در بغل

برگوشۂ بساط غریبست و آشناست | گلبن ز یار گل بود و شاخ کوے گل
تا گل برنگ و بوے کہ ماند کہ در چمن | گل در لباس گل آمدہ در جستجوے گل
زانگہ کہ عندلیب لقب دادہ مرا | افزودہ امید من و آبروے گل
در موسم تموز گلابے بہ تن بریز | تا آب رفتہ باز بیاید بجوے گل
غالب ز وضع طالعم آید حیا کہ داشت | چشمی بسوے بیل و چشمی بسوے گل

تن برکرانہ ضائع و دل درمیانہ غافل | چوں غرقۂ کہ ماند رختش بسوے ساحل
راز تو در نہفتن تیخانہ ریخت برلب | تیر تو در گذشتن پیکاں گداخت در دل

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم | در بزم رنگ و بو نمطی دیگر افگنم

نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم
بادیریان ز شکوۂ بیدادِ اہل دیں
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
منصور فرقۂ علی اللّٰہیان منم

ابرم کہ ہم بروئے زمین گوہر افگنم
مہری ز خویشتن بدل کافر افگنم
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
آوازۂ انا اسد اللّٰہ در افگنم

شعلہ چکد ز غم گراگل شگفد مژدہ کو
دور فتادم زیار ماہی بے دجلہ ام
آن تن چوں سیم خام وانہمہ انگیز تن
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس

شمع شبستانیم بادِ سحرگاہیم
نیست دمے در کنار وجدۂ بے ماہیم
تا چہ فراہم شدست اجرتِ جانکاہیم
ہم اسد اللّٰہیم و ہم اسد اللّٰہیم

برلب یا علی سرای بادہ روانہ کردہ ایم
بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ
ناخن غصہ تیز شد دل بستیزہ خو گرفت
غالب ازانکہ خیر و شر جز بقضا نبودہ است

مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم
وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزانہ کردہ ایم
تا بجز او فتادہ ایم از تو کرانہ کردہ ایم
کار جہان ز بُردلی بے خبرانہ کردہ ایم

ہر قدم لختی ز خود رفتن بود در بار من
سینہ ہم دل ز بیدادِ فریبِ التفات

ہمچو شمع بزم در راہ فنا از خودم
سادگی بنگر کہ در دام تو تمیدِ خودم

عالم توفیق را غالب سواد اعظم — مهر حیدر پیشه دارم حیدرآباد خودم

خوی تو دانستم اکنون بهر من زحمت مکش — رام بودم تا دل امیدواری داشتم

دیگر ز خویشم خبر نبود تکلف برطرف — اینقدر دانم که غالب نام یاری داشتم

دیدم آن هنگامه بیجا خوف محشر داشتم — خود همان شورست کاندر زیست در سر داشتم

تا چه سنجم دوزخ و کوثر که من نیز این چنین — آتشی در سینه و آبی بساغر داشتم

بر سر راهش نشستم بر درش را هم نبود — خویش را از خویشتن بختی نکوتر داشتم

نامۀ شاهد دگر عنوان کشاهی دیگرست — آنچه ناید از هما چشم از کبوتر داشتم

هیچ میدانی که غالب چون بسر بردم بدهر — منکر طبع بلبل و شغل سمندر داشتم

پرتو مهر سیاهی زگلیم نبرد — سایه ام سایه شب و روز برابر دارم

سوخت دل بی تو ز وصلم چه کشاید اکنون — حسرت بیشتر و ذوق تو کمتر دارم

مرحبا سوختن و جان بخشی آتش غالب — خنده بر گریۀ خضر و سکندر دارم

شبهای غم که چهره بخوناب شسته ایم — از دیده نقش وسوسۀ خواب شسته ایم

زاهد خوشست صحبت ز آلودگی مترس — کاین خرقه بارها به می ناب شسته ایم

بیدست وپا بہ بحرِ توکل فتادہ ایم | از خویش گرد زحمت اسباب شستہ ایم
غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ دہ بہ لے | از سینہ داغ دوریِ احباب شستہ ایم

با تو عرض وعدہ ات حاشا کہ از بزم نیست | ہرچہ میگوئی ہمی خواہم کہ تکرارش کنم
راحت خود جستم و رنج فراوان یافتم | مژدہ دشمن را اگر جہدی در آزارش کنم
نکتہ ہایش بے دہن میریزد از لب غالبؔ | بیزبان گردم کہ شرح لطف گفتارش کنم

در عرض شوق صرفہ نبردیم در وصال | در شکوہ ہائے خواہ مخواہش گرفتہ ایم

تفصیل از حقیقت اشیا نوشتہ ایم | آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم
ایماں بغیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر | ز اسما گزشتہ ایم و مسمےٰ نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنے لفظ امید نیست | فرہنگنامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آئندہ و گزشتہ تمنا و حسرت ست | یک کاشکی بود کہ بصد جا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خاری بخون دل | قانون باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم
غالب الف بمان علم وحدت خود ست | بر لا چہ برفزود گر الّا نوشتہ ایم

برتر ز بے پردیِ ملک بہرِ کسرِ نفس | خود را بہ بند سلسلۂ آدم افگنم

خوشنودم از تو زپیٔ دورباش خلق — آوازهٔ جفای تو در عالم افگنم
دوزند گر به فرض زمین را به آسمان — حاشا کزین فشار در ابرو خم افگنم

گم گشته بکوی تو نه دل بلکه خبر هم — دلرزه ز خوی تو نه دم بلکه اثر هم
تا حسن به بی پردگی جلوه صلا زد — دیدیم که تاری ز نقابست نظر هم
اسکندر و سرچشمهٔ آبی که زلال ست — ما و لب لعلیں که شرابست و شکر هم
آن خانه برانداز بدل پرده نشینست — ای دیده تو نامحرمی و حلقهٔ در هم

هم بعالم ز اهل عالم برکنار افتاده ام — چون امام سبحه بیرون از شمار افتاده ام
کار و بار موج با بحرست خودداری مجوی — در شکست خویشتن بی اختیار افتاده ام

بود بدگو ساده با خود هم زبانش کرده ایم — از وفا آزردنت خاطر نشانش کرده ام
گوشهٔ چشمش بسیر بزم دلربایان با منست — وقت من خوش باد کز خود بدگمانش کرده ام
تا نیاز خورده بر بدمستی دوشم گرفت — بوسه را در گفتگو مهر دهانش کرده ام
غالب از من شیوهٔ نطق ظهوری زنده گشت — از نوا جان در تن ساز بیانش کرده ام

می ربایم بوسه و عرض ندامت میکنم — اختراعی چند در آداب صحبت میکنم

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بشہر — خانہ در کوے ترسایاں عمارت میکنم
کردہ ام ایماں خود را دستمزد خویشتن — می تراشم پیکر از سنگ و عبادت میکنم
زنگ غم نا آئینۂ دل جز بمی نتواں زدود — دردم از دہرست و با ساقی شکایت میکنم
غالبم غالب ہم آئیں بر تابم در سخن — بزم برہم میزنم چنداں کہ خلوت میکنم

غالب ایں لعب بگل مہر رضاجوئی نیست — تو خریدار گہر باش گہر بفشانم

تا کی عرف رضاجوئی دلہا باشم — فرصتم باد کزیں پس ہمہ خود را باشم
ہمچوں آں قطرہ کہ بر خاک فشاند ساقی — دورم از کنج لبت گر ہمہ صہبا باشم
قبلۂ گم شدگان رہ شوقم غالب — لاجرم منصب من نیست کہ یکجا باشم

گزشتم از نگہ در وصل فرصتم بادا — زبان کوتہ و دست دراز میخواہم
گرفتہ خاطر ز اسباب دلخوشی باقیست — ترانہ گہ نہ گنجد بہ ساز میخواہم

ز من حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم — نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم
زہ دیں نبود خم گدا دریاب — کہ خود چہ زہر بود کاں نہ نگیں دارم
ترا نگفتم اگر جان و عمر معذورم — کہ من وفاے تو با خویشتن یقیں دارم

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب — خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم"

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم — ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ رہ گزر پاشیم — مَی آوریم و قدح در میاں بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنی کارداں بگردانیم

گہی بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم — گہی بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم — بشوخیٔ کہ رخِ اختراں بگردانیم

ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم — بلائے گرمیٔ روز از جہاں بگردانیم

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم — ز نیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را — تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

بہ صلح بال فشانانِ صبح گاہے را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود — گر آفتاب سوی خاوراں بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالب — بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

دانش و گنجینه پنداری یکیست — حق نهان داد آنچه پیدا خواستیم
قطع خواهشها ز ما صورت نداشت — همت از غالب همانا خواستیم

نیم در بند آزادی ملامت شیوه‌ها دارد — شنیدم جامهٔ زندان ترا عیبست میپوشم
خدایا زندگی تلخست گر خود نقل و می نبود — دلی وه کز گداز خویش گردد چشمهٔ نوشم
مرنج از وعدهٔ وصلی که با من در میان آری — که خواهد شد بذوق وعدهٔ دیگر فراموشم
بهار گلشن کوی توام مسپار در خاکم — چراغ بزم نیرنگ توام مپسند خاموشم

وحشتی در سفر از برگ سفر داشته‌ایم — توشهٔ راه دلی بود که برداشته‌ایم
ناله تا گم نکند راه لب از ظلمت غم — جان چراغیست که بر راهگذر داشته‌ایم
داغ احسان قبولی ز لئیمانش نیست — ناز بر خرمی بخت هنر داشته‌ایم
بیش ازین مشرب ما نیز سخن سازی بود — لختی از خوشدلی غیر خبر داشته‌ایم
وارسیدیم که غالب بمیان بود نقاب — کاش دانیم که از روی که برداشته‌ایم

یا رب بشهوت و غضبم اختیار بخش — چندان که دفع لذت و جذب الم کنم
تا دخل من بعشق فزون تر بود ز خرج — خواهم که از تو بیش کشم ناز و کم کنم
خشکست کشت شیوهٔ تحریر رفتگان — سیرابش از نم رگ ابر قلم کنم

بیا لطف ہوا بنگر کہ چون موج مے از مینا   گل از شاخ گلستی جلوہ گرمیش از دمیدن ہم
نہ از مہرست گر بر داستانم می نہد گوشی   ہمان از نکتہ چینی خیزدش ذوق شنیدن ہم
چہ پرسی کز لبت وقت قدح نوشی چہ میخواہم   ہمین بوسیدنی چون مست ترگردی مکیدن ہم
ادب آموزیش در پردۂ محراب می بینم   نخست از جانب حق بودہ انداز خمیدن ہم
نخواہد روز محشر داد خواہِ خویش عالم را   تو بخشید ایزد شیوۂ ناز آفریدن ہم
دل از تمکین گرفت و تاب وحشت نبودم غالب   نگنجد در گریبان من از تنگئ دریدن ہم

خاموشم و در دل ز ملالم اثرے نیست   سر جوش گداز نفسم لائے ندارم
ناز تو فراوان بود و صبر من اندک   تو دست و دلی داری و من پائے ندارم
بگذار کہ از راہ نشینان تو باشم   پائے کہ شود مرحلہ پیمائے ندارم

زخم جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم   موج گہرم جنبش و رفتار ندانم
نقدِ خردم سکۂ سلطان نپذیرم   جنس ہنرم گرمی بازار ندانم
غالب نبود کوتہی از دوست ہمانا   زانسان کہ دہدم کام کہ بسیار ندانم

در ہر انجام محبت طرح آغاز افگنم   مہر بردارم از و تا ہم برا و باز افگنم
ہر قدر کز حسرت آیم در دہن گردد ہمے   ہم ز استغنا برو بے بخت ناساز افگنم

ترک صحبت کردم و در بندِ تکمیلِ خودم
نغمۂ ام جان گشت خواهم و تنِ سازِ افگنم

ای ز سازِ زنجیرم در جنوں نواگر کن
نبد گر بدیں ذوق ست بادۂ گراں تر کن

زانچه دل زہم پاشد لب چه طرف بر بندد
یا مجالِ گفتن ده یا ز گفته باور کن

زین درونه کاویها گوهرم بکف نامد
خدمتی معین شد اجرتی مقرر کن

بخششِ خداوندی گر فراخورِ ظرف ست
هم به هوش بیشی ده هم به می توانگر کن

ہاں پری شیوه غزالان ز مردم رمِ شان
دل گرم بخمِ طرّهٔ خم در خمِ شان

آشکارا کُش و بدنام و نکونامی جوی
آه ازین حالتِ و آنکس که بود محرمِ شان

رشک بر تشنهٔ تنها روِ وادی دارم
نه بر آسوده دلانِ حرم و زمزمِ شان

ای که راندی سخن از نکته سرایانِ عجم
چه بما منت بسیار نهی از کمِ شان

هند را خوش نفسانند سخنور که بود
باد در خلوتِ شان مشک فشان از دمِ شان

مومن و نیّر و صهبائی و علوی وانگاه
حسرتی اشرف و آزرده بود اعظمِ شان

غالبِ سوخته جان گرچه نیرزد به شمار
هست در بزمِ سخن همنفس و همدمِ شان

جنون مستم بفصلِ نوبهارم میتوان کشتن
صراحی بر کف و گل در کنارم میتوان کشتن

بجرمِ اینکه در مستی بپایاب برده ام عمری
بکوے میفروشان در خمارم میتوان کشتن

طاق شد طاقت ز مشقت بگران خواہم شدن　　مہربان شو ورنہ بر خود مہربان خواہم شدن
خار و خس ہر گہ در آتش سوخت آتش میشود　　مردم از ذوق لبت چنداں کہ جاں خواہم شدن
بسکہ فکر معنے نازک ہمے کاہد مرا　　شاہد اندیشہ را موی میاں خواہم شدن

دل زاں مژۂ تیز بیک بار کشیدن　　دامن بدرشتے بود از خار کشیدن
دارم سر این رشتہ بدانسان کہ ز دیرم　　تا کعبہ توان بُرد بزنّار کشیدن
حق گویم و نادان بزبانم دہد آزار　　یارب چہ شد آن فتوئ بردار کشیدن
ز آسایش دل گرچہ مرادی دگرم نیست　　باری نفس چند بہ ہنجار کشیدن
فرجام سخن گوئے غالب بتو گویم　　خونِ جگر ست از رگِ گفتار کشیدن

فصلے از باب شکستِ رنگ انشا کردہ ام　　میتواں راز درونم خواند از سیمای من
مست دردم ساز و برگ انتقامم نایست　　بے شکستن بر نیاید باد از مینای من
خاطر منت پذیر و خوے نازک دادہٗ　　گر ببخشی شرمسارم ورنہ بخشی وای من

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن　　حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن
شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس　　اینقدر دانم کہ دشوار ست آسان زیستن
برد گوی خرّمی از ہر دو عالم ہر کہ یافت　　در بیابان مردن و در قصر و ایوان زیستن

راحتِ جاوید ترکِ اختلاطِ مردمست
چون خضر باید ز چشمِ خلق پنہاں زیستن

تا چه راز اندرتہ ایں پرده پنہاں کرده اند
مرگ مکتوبی بود کو راست عنواں زیستن

روز وصلِ یار جاں ده ورنه عمرے بعد ازیں
ہمچو ما از زیستن خواہی پشیماں زیستن

با رقیباں ہمقفسم آه بہ عوی گاه شوق
مردنست از ما و زیں مشتی گرانجاں زیستن

بر نوید مقدمت صد بار جاں باید فشاند
بر امید وعده ات زینہار نتواں زیستن

خیره کند مرد را ہمسر دم داشتن
حیف ز ہیچوں خودی چشم کرم داشتن

وائے ز دل مردگی خوے بد انگیختن
آه ز افسردگی روے دژم داشتن

تازگی شوق چیست رنگ طرب ریختن
چہره ز خوناب چشم رشکِ ارم داشتن

با ہمه اشکستگی دم ز درستی زدن
با ہمه دلخستگی تاب ستم داشتن

در خم دام بلا بال فشاں زیستن
با سر زلف دوتا عہد بدو ہم داشتن

بہر فریب از ریا دام تواضع مچیں
دل ز ربایه بہی تیغ ز خصم داشتن

نقش پے رفتگاں جاده بود در جہاں
ہر که رود بایدش پاس قدم داشتن

غالب آواره نیست گرچه بہ بخشش سزا
خوش بود از چو توئی چشم کرم داشتن

چه غم ار جبهه گرفتی ز من احتراز کردن
نتواں گرفت از من بگذشته ناز کردن

تو و در بلکہ رشوه گره از جبیں کشودن
من و بر رخ دو عالم در دل فراز کردن

نفسم گداخت شوقت ہمت گر تو دانی / کز تاب نالہ خون شد نہ ز پاس راز کردن
بلہ تازہ گشتہ غالبؔ روش نظیری از تو / سزد اینچنیں غزل را بہ سفینہ ناز کردن

خجل ز راستی خویش میتوان کردن / ستم بجان کج اندیش میتوان کردن
توجمع باش کہ مارا دریں پریشانے / شکایتیست کہ با خویش میتوان کردن
سر از حجاب تعین اگر برون آید / چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش میتوان کردن
اگر بقدر وفا میکنی جفا حیف ست / بمرگ من کہ ازیں بیش میتوان کردن
کسی بجو کہ مرا در این سفر غالبؔ / گواہِ بیکسی خویش میتوان کردن

خاکی بروئے نامہ فشاندیم مفت تست / ناخواندہ صفحہ حال زعنوان شناختن
مائیم و ذوق سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ / در عشق نیست کفر ز ایمان شناختن
غالبؔ بقدر حوصلہ باشد کلامِ مرد / باید ز حرف نبضِ حریفان شناختن

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن / این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است / شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
ہم سواد صفحہ مشک سودہ خواہد بیختن / ہم دواتم نافِ آہوے ختن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت / دستگاہ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

بے چہ میگویم اگر اینست وضع روزگار — دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

چشم کور آئینۂ دعوی بکف خواہد گرفت — دست شل مشاطۂ زلف سخن خواہد شدن

شاہد مضمون کہ اینک شہری حسن دولت — روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں — ہمنوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن

شاد باش اے دل دریں محفل کہ ہر جا نغمۂ لیست — شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن

ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید — ہم بساط بزم مستی پرشکن خواہد شدن

پردہ ہا از روے کار ہمدگر خواہد فتاد — خلوت گبر و مسلماں انجمن خواہد شدن

گرد پندار وجود از رہگذر خواہد نشست — بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن

دیدہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ — تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

حق کہ حقیقت سمیعت فلانے بشنو — بشنو گر تو خداوند جہانے بشنو

لن ترانی بجواب ارنی چند و چرا — من نہ ایم بشناس و تو نہ آنے بشنو

سوئے خود خوان و بخلوت گہ خاصم جا دہ — آنچہ دانی بہ شمار آنچہ ندانے بشنو

لحنی آئینہ برابر نہ و صورت بنگر — پارۂ گوش بہ من دار و معانے بشنو

ہر چہ سنجم تو ز اندیشہ برے بپذیر — ہرچہ گویم تو ز عیش جوانے بشنو

داستان من و بیداری شبہای فراق — تا نہ خسپی و بپ سم نفشانے بشنو

چہ ز جو ییدہ ستم و نیز فضولے نکنم — من و اندوہ تو چندانکہ توانے بشنو

زینکه دیدی به تجسیم طلب رحم خطاست
سخنی چند ز غمهائے نہانی بشنو

محو افسون گر نازیم که او را با ما
دور باشیست که آهنگ بپا خیز دارد

دیگر امروز بما بر سر جنگ آمده ست
به ادائی که همه صلح و صفا خیز دارد

بلبل گلشن عشق آمده غالب ز ازل
حیف گر زمزمهٔ مدح و ثنا خیز دارد

در بادهٔ طهور غم محتسب کجا
در عیش خلد لذت بیم و زوال کو

غالب بشعر کم ز ظهوری نیم ولے
عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

دولت بغلط نبود از سعی پشیمان شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

از هرزه روان گشتن قلزم نتوان گشتن
جوئی بخیابان رو سیلے به بیابان شو

هم خانه بسامان به هم جلوه فراوان به
در کعبه اقامت کن در بتکده مهمان شو

آوازهٔ معنی را برساز دبستان زن
هنگامهٔ صورت را بازیچهٔ طفلان شو

گر چرخ فلک گردی سر رشتهٔ فرمان نه
ور گوئی زمین باشی وقف خم چوگان شو

در بند شکیبائی مردم ز جگر خاے
اے حوصله تنگی کن اے غصه فراوان شو

جان داد بغم غالب خشنودی روحش را
در بزم عزا می کش در نوحه غزلخوان شو

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند — جز روزۂ درست بہ صہبا کشودہ
دربزمِ غالب آئی و بشعر و سخن گرائے — خواہی کہ بشنوی سخنِ ناشنودہ

گر نہ مشتاق عرض دستگاہ حسن خویش — جان فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردہ
بہر دوزخ در نہاد شرمساری مضمرست — انتقامست اینکہ با مجرم مدارا کردہ
صد کشاد آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودہ — مژدہ باد آنرا کہ محو ذوق فردا کردہ
چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود — پیش ازان کاین در رسد آنرا مہیا کردہ
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہرست — خویش را در پردۂ خلقی تماشا کردہ

خواستم شکوۂ بیداد تو انشا کردن — قلم از جوش رقم شد خس طوفان زدہ
وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید — نامۂ وا شدۂ مہر بعنوان زدہ
بُرد در انجمن شعلہ رخانم غالب — ذوق پروانۂ بر روئے چراغان زدہ

بر دست و پائے بندگرانے نہادہ — نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ
ایمن نیم ز مرگ اگر رستہ ام ز بند — دلدوز ناوکے بہ کمانے نہادہ
گوہر ز بحر خیزد و معنی ز فکر رفت — بر ما خراج طبع روانے نہادہ
غالب ز صد مرد ہمانا خبر نداشت — کاندر خرابہ گنج نہانے نہادہ

بگوشم میرسد از دور آواز درا امشب   دلی گم گشتۂ دارم کہ در صحراست پنداری
از و باور ندارد دعویٰ ذوق شہادت را   نگاہش با رقیب و خاطرش با ماست پنداری

گر نہ نوا ہا سرود مے چہ غمستی   مستکرنیم گر نبود مے چہ غمستے
لے بہ سخن مزد لے ستائش اگر من   کشتِ کدیور درود مے چہ غمستے
نیست مشامی شمیم جوئے اگر من   غالیہ چیندین نشود مے چہ غمستے
چون دَرِ دعوے توان بہ لغو کشودن   من بہ ہنر گر کشود مے چہ غمستے
چون دل یاران توان بہزل ربودن   من بہ سخن گر ربود مے چہ غمستے

اے بہ صدمۂ آہی بر دلت ز ما باری   اینقدر گران نبود نالہ ز بیماری
غم چہ در ربود از ما اینک آنچہ بود از ما   سینۂ و اندوہی خاطرے و آزاری
اے فنا درے بکشا بوکہ در تو بگریزد   ہم ز خلق نومیدی ہم ز خویش بیزاری
ناز مومن و کافر بہ چہ دستگاہ آخر   سبحۂ و مسواکے قشقۂ و زناری
شوخی شمیمش بین جنبش نسیمش بین   غنچہ راست آہنگی مرو راست قاری

نخواہم ز صف حوران ز صد ہزار یکے   مرا بس است ز خوبان روزگار یکے
سراغ وحدت ذاتش توان ز کثرت جست   کہ سازست در اعداد بیشمار یکے

چگویم از دل و جانی کہ در بساط منست ستم رسیدہ یکے ناامیدوار یکے
دو برق فتنہ نہفتند در کف خاکے بلائے جبر یکے رنج اختیار یکے
مرو ز آئینہ خانہ کہ خوش تماشائیست یکے تو محو خودی و چو تو ہزار یکے
زہے نگاہِ سبکسیر و شرم دور اندیش یکے بدزدی دل رفت و پردہ دار یکے
چہ شد کہ ریخت زبان رنگ مدح از سخن بخون سرشتہ نوائے ز دل برآر یکے
دم از ریاست دہلی نمی زنم غالب منم ز خاک نشینانِ آن دیار یکے

غم راست بدلسوزی سعی ادب آموزی انداختہ گاتش را اندازہ نشانے
صدرہ بہوس خود را با وصل تو سنجیدم یک مرحلہ تن وانگہ صد قافلہ جانے
جان باغ و بہار آماد در پیش تو خاکے تن مشت غبار آماد در کوئی تو جانے
ساقی بزر افشانے دامن ز کریمانے پیمانہ گران تر بست گر بادہ گرانے
فیض ازلے بود مخصوص گروہی را حرفیست کہ مے خوردن آئین مغانے
غالب سرِ ہم بخشا پیمانہ مے در زن آخر نہ شب ماہست گیرم رمضانے

تا ہم ز دل برد کافر ادائے بالا بلندی کوتہ قبائے
ز خوے ناخوش دوزخ نہیبے وز روئے دلکش مینو لقائے
زردشت کیشی آتش پرستے برسم گزاری زمزم سرائے

چون مرگ ناگزیر بسیار تلخے — چون جان شیرین اندک وفائے
درکام بخشی ممسک امیری — در دلستانی مبرم گدائے
گستاخ سازی پوزش پسندے — طاقت گدازی صبر آزمائے
در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے — در مہربانی بستان سرائے
از زلف پر خم مشکیں نقابے — از تابش تن زرّیں ردائے
در عرض دعوے لیلیٰ نکوہے — بر رغم غالبؔ مجنون ستائے

بدل ز عربدہ جائی کہ داشتی داری — شمار عہد وفائے کہ داشتی داری
تو کز جور پشیماں شدی چہ میگوئے — دروغ راست نمائی کہ داشتی داری
بسینہ چون دل و در دل چو جان خزیدی باز — نگاہ مہر فزائی کہ داشتی داری
عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتوان — خرد فریب ادائی کہ داشتی داری
خراب بادۂ دوشینہ سرت گردم — ادائے لغزش پائی کہ داشتی داری
جہانیان ز تو برگشتہ اند گر غالبؔ — ترا چہ باک خدائی کہ داشتی داری

شاد باش اے غم ز بیم مرگم ایمن ساختی — گشت صرف زندگانی بود گر دشوارئیے
با خرد گفتم چہ باشد مرگ بعد از زندگی — گفت ہی خواب گرانی از پس بیدارئیے
زلہ بردار ظہوری باش غالبؔ بحث چیست — در سخن دریوزگی باید نہ دکان دارئیے

رفت آنکہ کسب بوی تو از باد کردمے — گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ گر براہ تو جان دادمی ز ذوق — از موج گرد دیدہ نفس ایجاد کردمے
رفت آنکہ گر ببت نہ بتقریب نواختمے — رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے
رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمے — در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے
رفت آنکہ در ادائے سپاس پیام تو — ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمے
اکنون خود از وفائے تو آزار می کشم — رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے
بندم منہ ز حرف کہ تابم نماندہ است — رفت آنکہ خویش را ببلا شاد کردمے
آخر بدگاہ دگر اوفتاد کار — رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کردمے
غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است — رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

بہ توانائی کوشش نتوان یافت ترا — سرخوشیہائے قبول ازلی را مانے
جز بچشم و دل والاگہران جا نہ کنے — جلوۂ نقش کف پائے علی را مانے
بدل ہر کہ بچشم تو درآید ناگاہ — داری آن مایہ تصرف کہ ولی را مانے
اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب — گر تری نکتہ سنجم شیخ علی را مانے

اے کہ گفتم ندہی داد دل آری ندہی — تا چو من دل بمغان شیوہ نگاری ندہی
چشمۂ نوشش ہمانا نتراود ز دلے — کش بگیری و در اندیشہ فشاری ندہی

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند
تو کجا باشی کہ بخود زحمت کاری ندہی؟

رہزنان اجل از دست تو ناگاہ برند
نقد ہوشی کہ بسودائے بہاری ندہی

بہ خم طرّۂ حوران بہشت آویزند
ناز پروردہ دلی را کہ بہ یاری ندہی

گر تنزل بتود ابر بہارے غالب
کہ دُر افشانی و زر افشاندہ شماری ندہی

فرقیست نہ اندک ز دلم تا بہ دل تو
معذوری اگر حرف مرا زود نیابی

در مشرب ما خواہش فردوس نجویے
در مجمع ما طالع مسعود نیابی

در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینے
در آتش ہنگامۂ ما دود نیابی

غالب بہ دکانی کہ بامید کشودیم
سرمایۂ ما جز ہوس سود نیابی

سرچشمۂ خونست ز دل تا بزبان ہاے
دارم سخنی با تو و گفتن نتوان ہاے

سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویان
نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہاے

باد آورِ ناگفتہ شنو رفت حوالت
دردی کہ بہ گفتن نہ پذیرفت گراں ہاے

از جنت و سرچشمۂ کوثر چہ کشاید
خون گشتہ دل و دیدۂ خونابہ فشاں ہاے

سیماب تنی کز رم برقست نہادش
گر دیدہ مرا مایۂ آرامش جاں ہاے

بوے گل و شبنم نسزد کلبۂ ما را
صرصر تو کجا رفتی و سیلاب کجائے

حشر مست و خدا داد رو ہنگامہ بپایاں
باگرمیٔ ہنگامۂ خواہش نہ شکیبم

اے شکوۂ بے مہری احباب کجائے
آتش بہ شبستان زدم اے آب کجائے

آنکہ جوید از تو شرم و آنکہ خواہد از تو مہر
گر نہ در تنگی دہان دوست چشم دشمنست

تقوے از میخانہ و داد از فرنگ آرد ہمی
از چہ رو بر کام محبوبان کار تنگ آرد ہمی

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار دلبری | در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری
تا نبود بہ لطف و قہر ہیچ بہانہ درمیاں | شکر گرفت نارسا شکوہ شمرد سرسری
اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روے نیست | در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری
ہر کہ دلست در برش داغ تو رویدش ز دل | تا چو بہ دیگرے دہد باز برے بہ داوری
رشک ملک چہ و چرا چون بتو رہ نمی برد | بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبکسری
حیف کہ من بجوئے تو تیم و ز تو سخن رود کہ تو | اشک بہ دیدہ بشکرے نالہ بہ سینہ بشکری
بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل | غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

زبسکہ با تو بہر شیوہ آشنا ستمے | بہ عشق مرکز پرکار فتنہ ہا ستمے
امیدگاہ من و ہمچو من ہزار یکیست | ز رشک در صدد ترک مدعا ستمے
سخن ز دشمن و غمہائے ناگوارش نیست | ز دوست داغ ستمہائے ناروا ستمے

چگونہ تنگ توانم کشیدنت بکنار — کہ با تو در گلہ تنگیٔ قباستے
بباده داغ خودی از رواں فروشستہ — ہلاک مشربِ رندانِ پارساستے

نگویم تشنہ و جان و دلم افسردہ ہی ساقی — بده نوشینہ داروے کہ ہم آتش ہم آبستے
نگویم ظالمی اما تو در دل بودہ وانگہ — دلی دارم کہ ہیچون خانۂ ظالم خرابستے
منال از عمر و ساز عیش کن کز باد نوروزے — بگلشن جلوہ رنگینئ عہد شبابستے

غزلیات از مجموعۂ سبدِ چیں

اے خداوند خردمند جہان داور دانا — شے بہ نیروئے خرد بر ہمہ کردار توانا
اے برفتار و بدیدار ز زیبائی و خوبی — سروِ نوخاستہ آسا، مہِ ناکاستہ مانا
بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقدہ کشایا — بکرم ابر عطایا، بغضب برق سنانا
بہ نگہ خستہ نوازا، بہ سخن بذلہ طرازا — بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا

جز دفع غم ز بادہ نبودست کام ما — گوئی چراغ روز سیاہ است جام ما
اے باد صبح عطرے ازاں پیرہن بیار — تسکین ز بوئے گل نپذیرد مشام ما
غالب بقول حضرت حافظ ز فیضِ عشق — "ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما"

ہلہ من عاشقِ ذاتم تننہ ناہا یاہو ناظرِ حسنِ صفاتم تننہ ناہا یاہو

موسیٰ و خضرِ تماشائے تجلی بہ طور من نہ دربندِ جہاتم تننہ ناہا یاہو

ظلمتِ کفر میں روشنی طبع نگر چشمۂ آبِ حیاتم تننہ ناہا یاہو

مجرمِ عالمِ رواج بپاداشِ عمل خستۂ قیدِ حیاتم تننہ ناہا یاہو

تکیہ بر مغفرتِ اوست نہ بر طاعتِ خویش تارکِ صوم و صلوٰتم تننہ ناہا یاہو

چشم دارم کہ برہ روی دہد بے خبری جز بدیں نیست نجاتم تننہ ناہا یاہو

غالبم تشنۂ تلخاب نہ ہم چوں حافظ "مایلِ شاخِ نباتم" تننہ ناہا یاہو

از جسم بجاں نقاب تاکے ایں گنج دریں خراب تاکے

ایں گوہرِ فرّخ یا رب آلودۂ خاک و آب تاکے

بیتابیٔ برق جز دمے نیست ما دریں ہمہ ضطراب تاکے

جاں در طلبِ نجات تا چند دل در تعبِ عتاب تاکے

غالب بچنیں کشاکش اندر یا حضرتِ بوتراب تاکے

بمقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند

کسے کہ پائے ندارد چگونہ راہ رود خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند

دم از وجودکُ ذنبٌ زدند بے خبراں چساں عطیۂ حق را گناہِ ما گویند

بلے گناہ بود دعوئ وجود از ما | بہ اہل راز چنیں گوئی تا بجا گویند
نکردہ زر مسِ خود را و بہرِ عرضِ فریب | بہ پیشِ خلق حکایت زکیمیب گویند
کسان کہ دعوئ نیکی ہمی کنند مرا | اگر نہ نیک شمارند بد چرا گویند
طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا | بس است ہم چو توئی را کہ پارسا گویند

بگوئی مردہ کہ در دہر کارِ غالب زار
از آں گذشت کہ درویش و بے نوا گویند

از مجموعہ سبد چین

عبودیت نکند اقتضائے خواہش کار | دعا بصیغۂ امرست و امر بے ادبیست

رباعیات

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم — زان رو بہ صفائے دم تیغ ست دمم
چون رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر — شد تیر شکستۂ نیاگان قلمم

راہیست ز عبد تا حضور اللہ — خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
این کوثر و طوبیٰ کہ نشانہا دارد — سرچشمۂ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

آن مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
داد بجہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا چرا توانا نبود

چرگر نه زخمه زخشم بر چنگ زند
پیداست که از بهر چه آهنگ زند
در پردهٔ ناخوشی خوشی پنہانست
گازر نه زخشم جامه بر سنگ زند

با دست غم آں باد که حاصل ببرد
آبِ رخ ہوشمند و غافل ببرد
بگذاشته ام خمی ز صہبا بپسر
کش اندهِ مرگ پدر از دل ببرد

زانجا که دلم بہ وہم در بند نبود
با ہیچ علاقه سخت پیوند نبود
مقصودِ من از کعبه و آہنگ سفر
جز ترک دیار و زن و فرزند نبود

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری
نازم که گزیده آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند میخرامی دانم
در خانہ زن ستیزه خوئے داری

زیں موئے کہ بر میانِ تست اے بدکیش
باشد کمرت خجل ز بے برگی خویش
آمیزش موئے با میانے کہ تراست
ہمسایگی توانگر است و درویش

در بزم نشاط خستگاں را چہ نشاط
از عربدہ ہائے بستگاں را چہ نشاط
گر ابر شراب ناب بارد غالب
ما جام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

قانع نیم از بہشت نیزم بخشند
از بخشش خاص تا چہ چیزم بخشند
امید کہ صرفِ رونمائے تو شود
جانے کہ بروزِ رستخیزم بخشند

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دہر
ریزد ہمہ دُرد و دَرد و تلخابۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بہ غمزہ گشت و مرّیخ بہ قہر

یارب بجہانیان دل خرم دہ
در دعوی جنت آشتے باہم دہ
شداد پسر نداشت یا غش از تست
آن مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

خوشتر بود آب سوہن از قند و نبات
بادی چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
ایں پارہ عالمی کہ ہندش نامند
گوئے ظلمات و سوہنست آب حیات

شرطست کہ روے دل خراشم ہمہ عمر
خونابہ برُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر برگ مومن
چون کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

غالب ہر پردہ نوائے دارد
ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
برچید یبوست از دماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

غالب روش مردم آزاد جداست
رفتار اسیران ره وزاد جداست

ما ترک مراد در ارم میدانیم
وان باعجز ضبطے شداد جداست

هر کس ز حقیقت خبرے داشته است
بر خاک رہ عجز سری داشته است

زاهد ز خدا ارم بدعوے طلبید
شداد ہمانا پسرے داشته است

کشتے از موج سوئے ساحل برود
رهرو از جاده تا منزل برود

خود شکوه دلیل رفع آزار بست
آید بزبان هر انچه از دل برود

اے آنکه دهی مایه کم خواهش بیش
آن روز که وقت باز پرس آید پیش

بگذر رم کرمن خیالے دارم
با حسرت عیشهاے ناکرده خویش

غالب به سخن گرچه گست همسر نیست
ز نشئه هوش هیچت اندر سر نیست

مے خواهی دم مفت و نغز و نگه بسیار
این باده فروش ساقی کوثر نیست

غالب غم روزگار ناکام گشت
ز تنگئ دل بحلقه دام گشت

هم غیرت سر بزرگی خاصم سوخت
هم رشک نشاط مندی عام گشت

آنرا کہ بود دُرستے درخورِ جام
ہم محرمِ خاص آید و ہم مرجعِ عام
آسان نبوَد گشاکش پاسِ قبول
زنہار نگردی بہ نکوئے بدنام

در عالمِ بے زری کہ تلخست حیات
طاعت نتوان کرد بامیدِ نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰة
بودی بوجودِ مال چوں حج و زکوٰة

ہر چند زمانہ مجمعِ جہّال ست
در جہل نہ حالِ شان بیک منوالست
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے
فرقِ خرِ عیسیٰؑ و خرِ دجّال ست

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم
شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست
در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

اے دوست بسوے ایں فرو ماندہ بیا
از کوچۂ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگِ توام
بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

شب چیست سویدائے دلِ اہلِ کمال
سرمایہ دہِ حسن ز زلف و خد و خال
معراجِ نبی بشب ازاں بود کہ نیست
وقتے شایستہ تر ز شب بہرِ وصال

ہر چند تواں بے سر و ساماں بودن
بازیچۂ خوئے زشت نتواں بودن
باللہ کہ ز دشنہ بر جگر سخت ترست
از کردۂ خویشتن پشیماں بودن

بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر
از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بیمایہ بفکر سود ماندم ہمہ جا
بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

دارم دل شاد و دیدۂ بینائے
وز کری گوشم نہ بود پروائے
خوبست کہ نشنوم ز ہر خود رائے
گلبانگ انا ربکم الاعلائے

آنرا کہ ز دست بے زری پامال ست
رسوائی نیز لازم احوال ست
خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے
ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

اوراق زمانہ در نوشتیم و گذشت
در فن سخن یگانہ گشتیم و گذشت
مے بود دوائے ما بہ پیری غالب
زاں نیز بہ ناکام گذشتیم و گذشت

گر ذوق سخن بدہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ز مجموعہ "سید جین" و "باغ دودر"

زمیتان کہ ہمیشہ در روانی مائیم
سرچشمہ راز آسمانی مائیم
لختے زد ساتییر بود نامۂ ما
ساسان ششم بہ کاردانی مائیم

ہر چند خرد ز تاب می پست شود
وز ضعف خرد وہم قوی دست شود
ہر کس کہ خرد دارد ازیں جوہر ناب
آنمایہ چرا خورد کہ بدمست شود

اے دادہ بباد عمر در لہو افسوس
زنہار مشو ز رحمت حق مایوس
ہشدار کز آتش جہنم حق را
تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

از دہر دلم دیدہ زہر دری جست
از بادۂ ناب یکدو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داں بخشید بمن
آبے کہ برائے خود سکندر می جست

یارب تو کجائی کہ بما زر ندہی
بیدرد خدائی کہ بما زر ندہی
نے نے تو نہ غائبی و نہ بیرحمی
بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندہی

مؤلف : ظ انصاری

آرٹسٹ : فیض مجدد

خوشنویس : سلامت رضوی، عبد السلام، شمس اعظمی، محمد قاسم

ترتیب و تزئین : نور الدین آزاد

کتابت : مارچ ۱۹۶۹ء

طباعت : فروری ۱۹۷۲ء

تعدادِ اشاعت : ۱ ہزار (بار اول)

طابع : لیڈر پریس، نوپین ممبئی ۱۰

ملنے کے پتے
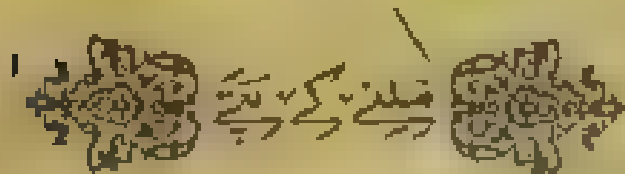
- مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
- مکتبۂ جامعہ، پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال ممبئی ۳
- علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ ممبئی ۳
- خواجہ پبلشنگ ہاؤس، بہ ٹینک اسٹریٹ ممبئی ۹

قیمت ۱۵ روپے
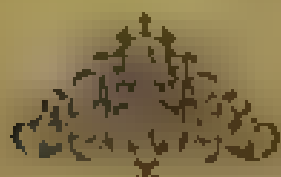
ظ۔ انصاری کی کچھ تحریریں

جارج برنارڈ شا (۱۹۵۱ء) حیات اور فن کا مطالعہ (مکتبہ برہان۔ اردو بازار دہلی)

ورق ورق (۱۹۵۲ء) شہ پارے۔ تاثرات (علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی 3)

کمیونسٹ اور مذہب (۱۹۵۸ء) نظریاتی اور عملی پہلو (مکتبہ شاہراہ) اردو بازار دہلی

زبان و بیان (۱۹۵۹ء) تنقیدی مضامین۔ آزاد کتاب گھر (اردو بازار دہلی)

روس کا شاعر اعظم، پوشکن (۱۹۶۶ء) حیات اور فن کا مطالعہ (زیر طبع)

شعر و شاعری (۱۹۷۳ء) پوشکن کے کلام کے ۵۳۰۰ مصرعے۔ منظوم مع دیباچہ

غالب شناسی (۱۹۶۵ء) حیات اور فن کا مطالعہ (علوی بک ڈپو بمبئی 3)

چیخف (۱۹۷٤ء) حیات اور فن کا مطالعہ (ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی)

سوویت مشاعرہ (۱۹۷٤ء) موجودہ روس کے پندرہ شعرا کا کلام مع تعارف

مطبوعہ ماسکو۔ (یہ مطبوعات مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ دہلی۔ بمبئی سے بھی مل سکتی ہیں)

ترجمے

انقلاب روس (۱۹٤٦ء) ہیولٹ جانسن (قومی دارالاشاعت۔ لاہور)

چینی گاؤں (۱۹٤۹ء) تیں چین کا ناول (کتب پبلشرز۔ بمبئی)

زلفوں کے سائے میں (۱۹۵۱ء) چینی ناولٹ (مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی)

چین کی بہترین کہانیاں (۱۹۵۳ء) (مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار دہلی)

استالین (دو جلدوں میں) (۱۹۵۳ء) مضامین اور سوانح عمری (P. P. H نئی دہلی)

مارکسی تعلیم کا سلسلہ (۱۹۵۴ء) (۱۳ جلد) تاریخ، فلسفہ اور اقتصادیات پر مقالے
(P.P.H. نئی دہلی)

روس کی بہترین کہانیاں (۱۹۶۲ء) تین جلدوں میں انتخاب (روسی زبان سے)
پروگریس اشاعت گھر - ماسکو

سوویت یونین کی تاریخ (۱۹۶۲ء) مکمل (جدید) تاریخ - ضخیم کتاب
(پروگریس اشاعت گھر - ماسکو)

دستوئیفسکی (۱۹۵۸ء) بچارے لوگ (ناول) خواب پریشان (ناول)
(۱۹۷۲ء) جواری (ناول) ذلتوں کے مارے لوگ (ناول)

پوشکن (۱۹۶۰ء) حکم کی بیگم (ناول) منظوم کہانیاں دو ہزار شعر
منظوم ترجمے

چیخف تین سال (ناول)

لیو تالستائے سوانح عمری (جلد اول)

آئتماتوف جمیلہ (ناول)

مارکس اینگلس کی منتخب تصانیف (۱۹۷۱-۷۴ء)
۳ جلدوں میں۔ پروگریس پبلشر - ماسکو

خمسہ امیر خسرو (۱۹۷۲-۷۴ء) متن علمی و تنقیدی ۵ جلدوں میں

انتخاب غالب - مجموعہ مضامین - منظوم بزبان روسی
دو کتابیں اشاعت کے لئے تیار کیں

۵۰ ہزار الفاظ کے دو جامع لغت: اردو روسی لغت - روسی اردو لغت مطبوعہ ماسکو